کم سنی کی کہانیاں

کم سِنی کی کہانیاں

مرتبہ : سدھا سنجیو

مترجم : پروفیسر ظفر احمد نظامی

چلڈرن بک ٹرسٹ ☆ قومی کونسل برائے فروغ اردو زباں ☆ بچّوں کا ادبی ٹرسٹ

فہرست

پریشان کن داغ

ناشتہ پر اکیلا کی می نے خبر سنائی کہ "دیوالی کی چھٹیوں میں کچھ مہمان ہمارے ساتھ قیام کرنے کی غرض سے آرہے ہیں"۔اور مسرور کن انداز میں پوچھا"اکیلا کیا تم اندازہ کرسکتی ہو کہ وہ کون ہیں؟"

"مم...... مم"اکیلا نے اپنے پاپا کے اخبار کے آخری صفحہ پر جھک کر نظر ڈال کر بے خیالی میں اپنے ٹوسٹ کو چباتے ہوئے کہا۔اسے بڑی حیرت تھی کہ اتنے سارے چچاؤں، چچیوں، ماموؤں، ممانیوں اور رشتہ کے بھائیوں میں سے آخر کون ایسے لوگ تھے جو اس باران کے یہاں نازل ہونے والے تھے۔

"یہ انکل ارڈن اور آنٹی برنڈا ہیں جو ہیوسٹن سے آرہے ہیں"اس کی می نے بتایا اور پھر ایک ڈرامائی وقفہ کے بعد کہا کہ "ان کے ساتھ بچے بھی آرہا ہے۔ذرا سوچو کہ ایک زمانہ کے بعد تمہیں اپنے بچپن کے دوست سے مل کر کتنا اچھا لگے گا......"

"اکیلا اپنی کرسی پر سیدھی بیٹھ گئی،اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔"ان کے آنے کے امید کب تک ہے می؟"اس نے پوچھا وہ صبح کی سستی سے پوری طرح بیدار ہو چکی تھی۔

وہ لوگ ایک مہینہ کے اندر اندر یہاں آئیں گے تب تک تمہارے امتحانات بھی

ختم ہو جائیں گے۔ اس لیے تم پوری طرح اس کا لطف اٹھا سکو گی۔ لو یہ برنڈا آنٹی کا خط پڑھو" اس کی ممی نے کہا۔

خط ہاتھ میں لیتے ہوئے اکیلا خوشی خوشی مسکرانے لگی۔ اس کے ذہن میں سجے کے ساتھ بہت سی خوشگوار یادیں جاگ پڑیں تھیں۔

انکل اروِن اور اکیلا کے پاپا کالج میں ہم جماعت رہ چکے تھے۔ بعد ازاں ان دونوں کو بمبئی میں ملازمت مل گئی۔ شادی کے بعد یہ بھی ایک خوشگوار اتفاق ہی تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے پڑوسی بن گئے۔ اکیلا اور سجے ہم عمر تھے اور دونوں کی دلچسپیاں بھی یکساں تھیں۔ انہیں میدانی کھیل اور جانور پسند تھے اور دونوں تیرنے اور ٹینس کھیلنے کے لیے بھی ساتھ ساتھ ہی جایا کرتے تھے۔ دونوں ہی پالتو جانوروں کو اپنے اپنے گھروں میں پالنا چاہتے تھے لیکن اپنے والدین کو اس سلسلہ میں منانے میں کم نصیب ثابت ہوئے تھے۔ تاہم وہ ناامید نہیں ہوئے تھے اور برسوں انھوں نے کئی مرتبہ ایک بلّی، ایک کتّے اور سڑک پر پڑے ہوئے ایک زخمی پرندے کو پالنے کی پوری کوشش تھی۔ انھوں نے اپنے ہوم ورک، اپنی کامکس کی کتابوں اور اسٹکروں میں بھی حصّہ داری کی تھی اور ایک دوسرے کی سالگرہ کو بھی پارٹیوں میں ساتھ ساتھ منایا تھا۔ انھوں نے بحث و مباحثہ بھی کیے تھے اور بری طرح آپس میں لڑے بھی تھے لیکن وہ بہترین دوستوں کی ہی طرح رہے تھے۔

اور جب اکیلا اور سجے تقریباً گیارہ برس کی عمر کو پہنچے تو انکل اروِن کو امریکہ منتقل ہونے کا موقع مل گیا۔ اکیلا کو یاد آیا کہ جب سجے نے اسے یہ خبر سنائی تھی تو وہ اس قدر حیرت زدہ ہوئی کہ اسے یقین ہی نہیں آیا۔ وقت تیزی سے گزرتا گیا اور چھے مہینے کی مدت کے اندر اندر سجے اور اس کے کنبہ کے لوگ ہیوسٹن منتقل ہو گئے تھے۔

یہ پانچ سال پہلے کی بات تھی۔ اگرچہ دونوں خاندان کے افراد خط و کتابت اور بعض اوقات کرسمس کے کارڈوں کے ذریعہ ایک دوسرے سے رابطہ قائم کیے رہے لیکن اس سلسلہ میں وہ پڑوسیوں کی سی بات نہ تھی۔

اپنے خط میں آنٹی برنڈا نے ننجے کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں لکھا تھا۔ اس لیے خط کو تہہ کرتے ہوئے اکیلا نے سوچا کہ اتنا وقت گزر جانے کے بعد ننجے سے مل کر اسے لگے گا وہ امریکہ جانے سے پہلے کی طرح چیزوں کو پسند کرے گا یا وہ ایک بدلا ہوا شخص ہو چکا ہو گا۔

اکیلا نے سوچا کہ پچھلے پانچ برسوں میں وہ خود کتنی بدل گئی تھی۔ کامکوں اور اسٹکروں کے ساتھ ہی اس نے اپنی چوٹیوں اور قسموں سے آگے نکل کر اب وہ ایک حوصلہ مند جرنلسٹ بن گئی تھی۔ وہ اب بھی جانوروں کو چاہتی تھی اور ایک جانوروں کے گھر میں جز وقتی کام بھی کرتی تھی۔ اپنے آپ سے بے پروا ہو کر کہ ایک بار وہ ٹام بے بھی جا چکی تھی لیکن اب ایک تیز طرار لڑکی بن گئی تھی۔ اس لیے اب وہ اپنے پرانے دوست پر پہلے سے زیادہ اچھا تاثر قائم کرنا چاہتی تھی۔

اگلے دو ہفتوں کے دوران اکیلا اپنی پڑھائی میں مصروف رہی۔ امتحانات سے فراغت پا کر اس نے اپنے بال ترشوانے اور کچھ نئے کپڑے خریدنے کا پروگرام بنایا۔

امتحان کے آخری دن جب اس نے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا تو اسے اپنی ناک پر ایک مہاسہ نظر آیا۔ لیکن وہ مہاسہ بہت بڑا نہیں تھا۔ دراصل یہ ایک چھوٹا سا خفیف سا نقطہ سا تھا لیکن اکیلا جس کا زندگی میں کبھی مہاسے سے واسطہ نہیں پڑا تھا شدید طور پر صدمہ سے دوچار ہو گئی۔ اس نے سوچا یہ تو اس کے پروگرام میں شامل نہ تھا۔

اس نے اسے غور سے دیکھا اور کئی بار اپنے چہرے کو دھویا۔ اور ہر بار صابن سے دھو کر صاف کیا۔ لیکن اس سخت رگڑ کا ذرا سا اثر بھی مہاسہ پر نہیں پڑا۔ بلکہ
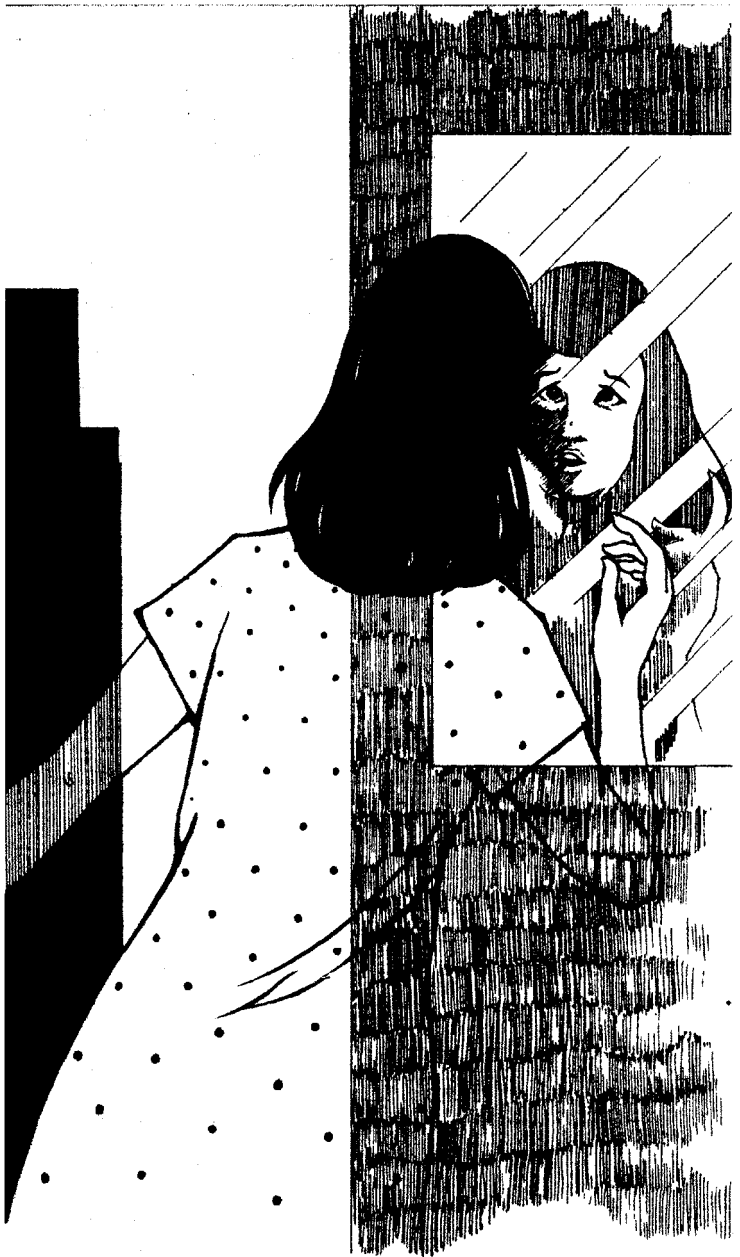
غائب ہونے کے بجائے وہ سرخ ہو کر اور نمایاں ہو گیا۔ دن بھر وہ مہاسہ اس کے ذہن سے محو نہ ہو سکا۔ جب وہ امتحان میں اپنا پرچہ لکھ رہی تھی تب بھی اس کی انگلیاں کئی بار اس مہاسہ کو چھوتی رہیں۔

اس نے اسے بری طرح رگڑا۔ شام تک اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ خاصا سوج گیا تھا۔ وہ ایک سرخ پھنسی کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اور صاف نظر آنے لگا تھا۔

اکیلا نے اپنے بہت سے دوستوں سے مشورہ کیا۔ انھوں نے اس سے نجات پانے کے لیے اسے بہت سے گھریلو نسخے بتائے۔ ٹوتھ پیسٹ، بیسن، ہلدی کا سفوف، ان سب کو ملا کر ایک لیپ تیار کر کے مہاسہ پر گاڑھا گاڑھا لگایا جائے۔ اکیلا نے بڑی ایمانداری کے ساتھ اس لیپ کو مہاسے پر تھوپا لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ در اصل مہاسہ ابھر کر چھوٹے چھوٹے مہاسوں کا ایک گچھا بن کر اکیلا کی ناک پر پھیل گیا۔

اکیلا کو مہاسوں کے اس گچھے نے دہشت ناک کر دیا۔ ایک مہاسہ برا ضرور تھا لیکن یہ پورا گچھا تو تباہ کن تھا۔ اکیلا کو یقین ہو گیا کہ وہ بڑی وحشت ناک اور بدصورت نظر آنے لگی ہے۔ یہ سوچتے ہی وہ پریشان ہو گئی۔ یہ خیال اور بھی مایوس کن تھا کہ یہ پریشانی ایک ایسے وقت رونما ہو رہی تھی جب وہ اپنے اس بہترین دوست سے ملنے والی تھی جو ان کے یہاں آنے والا تھا۔ اپنے بال ترشوانے اور نئے کپڑوں کو خریدنے کے لیے اس کا جوش مدھم پڑ گیا۔ جب اس کی ممی نے گھر میں اسے فکر مند ہو کر ادھر اُدھر ٹہلتے دیکھا تو انھوں نے اس سلسلے میں بات کی۔

''مہاسوں پر ہی دنیا ختم نہیں ہو جاتی''۔ انھوں نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔ ''انھیں تو کوئی دیکھتا بھی نہیں۔ اکیلا اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایشور کے لیے خوش رہو۔ ''کوئی فکر میں اتنا بدل کر رہ جاتا ہے، جتنا تم بدل کر رہ گئی ہو؟''

لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اکیلا اپنے ذہن سے ان مہاسوں کو جھٹک نہیں سکی۔ انھوں نے اس کے خیالات کو ہر گھڑی پریشان کیے رکھا۔ اس نے آئینہ میں انھیں گھنٹوں غور سے دیکھا۔ جب وہ گھر سے باہر گئی تو وہ بری طرح سیلف کانشس تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے ہر شخص اسے گھور رہا ہو۔ پریشان ہو کر اس کی ممی اسے جلد کے امراض کے ایک ماہر کے پاس لے گئی۔

ڈاکٹر نے ہمدردی کے ساتھ مسئلہ کو سنا اس نے اکیلا کے مہاسوں بھری ناک کا سنجیدگی سے معائنہ کیا تو اس کی ممی نے ناراضگی بھرے لہجہ میں کہا۔

"اکیلا پر کچھ زیادہ ہی اس کا ردعمل ہوا ہے۔ یہ طبّی مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن میں نے یہی بہتر سمجھا کہ اسے آپ کے پاس لے آؤں تاکہ آپ اسے کوئی معقول مشورہ دے سکیں!"۔

اکیلا کے اظہارِ پریشانی پر ڈاکٹر مسکرایا۔ اس نے کہا "تمہارا مسئلہ عام سی چیز ہے۔ اور تمہارا معاملہ تو بالکل معمولی ہے"۔

"آپ اسے معمولی کہتے ہیں"؟ اکیلا نے سختی سے اپنی ناک رگڑتے ہوئے کہا۔

"اوہ! یہی تمہارے مسئلہ کا سب سے بڑا سبب ہے" ڈاکٹر نے فوراً کہا۔ "تم مہاسوں کو ہاتھ بھی نہ لگاؤ۔ ایسا کرنے سے جراثیم پھیل جاتے ہیں اور حالت کو بدترین کر دیتے ہیں۔ میں تمھیں ایک صلاح تجویز کرتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ پانی پیو اور پتیوں والی سبزیاں اور پھل کھاؤ، مٹھائیوں اور تلی ہوئی چیزوں سے پرہیز کرو"۔

اکیلا تڑپ کر رہ گئی۔ اسے سموسے، آلو کے چپس اور مسالہ والی چاٹ بہت پسند تھی لیکن اگر اس کا مطلب اسے مہاسوں سے نجات دلانا تھا تو وہ ان سب کو بھی چھوڑ دینے کے لیے تیار تھی۔

"میں تمہیں ایک مرہم بھی دے رہا ہوں"۔ ڈاکٹر نے کہا "رات کو سونے سے پہلے اسے اپنے چہرہ پر مل لیا کرنا......"۔

"اور میرے یہ مہاسے کب ختم ہوں گے؟" اکیلا نے پوچھا۔

"یہ ایک ہفتہ سے زیادہ نہیں لیں گے؟"

"آپ کو معلوم ہے! ہمارے یہاں مہمان آنے والے ہیں......"

"دیکھو اور انتظار کرو......" ڈاکٹر نے کہا۔ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ فکر مندی مہاسوں میں اضافہ کر دیتی ہے......"۔

اگلے ہفتے اکیلا نے ڈاکٹر کی ہدایات پر سختی سے عمل کیا۔ جب اس کی سہیلیاں کوک پیتی رہتی تھیں تو وہ کچا سلاد اور پالک کھاتی رہتی تھی۔ پابندی سے کریم ملتی تھی اور ایک بار بھی اپنے چہرے کو چھوتی نہیں تھی! اس نے مہاسوں کے بارے میں فکر مند نہ ہونے کی کوشش بھی کی لیکن ڈاکٹر کی اس ہدایت پر عمل کرنا بڑا مشکل کام ثابت ہوا۔ بچے سے ملاقات کے خیال نے اسے خوشی سے پُر کر دیا تھا لیکن اسے یہ فکر بھی کھائے جا رہی تھی کہ کہیں یہ مہاسے اس موقع پر حارج نہ ہوں۔

پورا ہفتہ پر لگا کر اُڑ گیا اور مہمانوں کے آنے میں کچھ ہی دن باقی رہ گئے۔ سختی سے علاج کروانے کے باوجود اکیلا کے چہرے کے داغ بدستور موجود رہے اور اسے اس حقیقت کا یقین ہو گیا کہ بچے کی آمد کے وقت بھی وہ باقی رہیں گے۔

آخر کار وہ دن بھی آ ہی پہنچا جب اکیلا اپنے پاپا کے ساتھ مہمانوں کا خیر مقدم کرنے کے لیے ایرپورٹ جا رہی تھی۔ اس نے بڑے سلیقہ سے لباس زیب تن کیا، احتیاط سے اپنے چہرے پر میک اپ کیا اور جس قدر ممکن تھا اپنے مہاسوں کو چھپانے کی کوشش کی۔ آئینہ میں اپنے اوپر ایک نظر ڈالتے ہوئے اس نے خود کو یہ اطمینان دلا دیا کہ وہ بری نظر نہیں آ رہی ہے۔

ایرپورٹ پر اکیلا نے جلدی ہی انکل ارون اور آنٹی برنڈا کی شکلوں کو پہچان لیا لیکن ان کے ساتھ دراز قد اور چوڑے کاندھوں والے اجنبی کو دیکھ کر سوچنے لگی کیا وہ سچ ہو سکتا ہے؟ وہ سیدھا اپنی پرانی دوست کے پاس پہنچا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور جب سیلف کانشس اکیلا نے اس کی ہنستی ہوئی آنکھوں میں جھانکا تو بے یقینی کے عالم میں ایک لمبی سانس کھینچی۔

کیوں کہ اس کی ناک اور گالوں پر مہاسوں کی ایک فصل اُگی ہوئی تھی۔

دوہرے نغمے

سہ پہر تین بجے سے ہر شام ساڑھے آٹھ بجے تک اور ہر سنیچر اور اتوار کی صبح کے وقت سنگیتکا میوزک اسکول کے کمرے نت نئے نغموں اور سُروں سے گونجتے رہتے تھے۔ ایک کمرے میں ستار پر ایک کے بعد دوسرا راگ، دوسرے کمرے میں سرود یا تیسرے کمرے میں طرح طرح کی آوازوں کا مجموعہ پرانی عمارت کے گوشہ گوشہ میں آواز کی حسین اور روح پرور موجوں میں ابھرتا رہتا تھا۔

آج اسکول کے پرنسپل گرو نبین شرما کمرے میں لکڑی کے اونچے پلیٹ فارم کے سرے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سیکھنے والی کلاس کے سامنے انھوں نے جیسے ہی وائلن پر راگ بہاگ میں مہارت کے ساتھ ایک النکار چھیڑا تو کوئی بھی یہ اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ وائلن 'کی آواز' ایک مقامی ہندوستانی ساز ہونے کے علاوہ بھی کچھ اور شے ہو سکتی ہے۔

یہ خیال شروتی کے ذہن میں اسی وقت در آیا جب وہ چھے دوسرے طلبہ کے ساتھ نبین ماسٹر کے سامنے ایک چٹائی پر بیٹھی تھی۔

کلاس نے جو کچھ ابھی ابھی سنا تھا اسے نقل کرنے کی کوشش کی جو آسان کام نہیں تھا۔ کیوں کہ نبین ماسٹر کی دھنوں کو نقل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حسب معمول شروتی نے اس دھن کو پہلے اپنے وائلن پر بجانے کی کوشش کی اور پھر اسے

دہرانے کے لیے دوسروں کا انتظار کرنے لگی۔

سنگیتکا میوزک اسکول میں وائلن کے سنیئر طلبہ کی کلاس میں شروتی شرما بہترین طالبہ تھی۔ بے شک اسے دوسروں کے مقابلہ میں یہ برتری حاصل تھی کہ وہ نبین ماسٹر کی بیٹی تھی۔

موسیقی شروتی کے خون میں رچ بس گئی تھی۔ اسٹیج پر اس کے کامیاب فنی مظاہرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار پربھات پوری ڈیلی کلیرین کے مبصر نے لکھا تھا کہ "موسیقی اس کی رگ رگ میں دوڑتی ہے"۔ جب چھ برس کی عمر میں اس کے پاپا نے بچوں کا وائلن اس کے ہاتھوں میں تھمایا تھا تب سے شروتی اسے استعمال کر رہی تھی بالکل اسی طرح جیسے پرندے ہوا میں تیرتے ہیں۔

اب نو برس بعد اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے فن میں اس قدر اصلاح کر لی تھی کہ اس کے سننے والے اس سے زیادہ سے زیادہ سننے کی فرمائش کرتے تھے۔

اپنے پاپا کو مشاقی کے ساتھ ایک دوسری دھن بجاتے ہوئے دیکھا تو شروتی نے فیصلہ کر لیا کہ "آج رات میں ان سے کھانے کے بعد ضرور بات کروں گی"۔

ریڈیو پر سنتور پر نشر ہونے والے راگ جھنجھوٹی سنتے ہوئے ان تینوں افراد پر مشتمل کنبہ نے کھانا ختم کیا۔

جیسے ہی شروتی کی ممی لیلا دیوی نے میز پر سے اسٹین لیس اسٹیل کی پلیٹیں اور کٹوریاں اٹھائیں شروتی نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا "پاپا مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ میرا مطلب ہے...... میں آپ سے اجازت چاہتی ہوں......" اس کی آواز غیر یقینی ہو گئی تھی۔

"کیا بات ہے؟" نبین ماسٹر نے بے خیالی میں پوچھا۔ وہ کین کی ایک پرانی کرسی پر بیٹھے تھے اور آنکھیں بند تھیں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کہیں دور بیٹھے ہوں اور ان

تک رسائی ممکن نہ ہو۔

"یہ موسیقی کے ایک پروگرام کے بارے میں ہے جس میں مجھ سے دھن بجانے کے لیے کہا گیا ہے"۔ شروتی نے کہا۔

نبین ماسٹر نے حیرت سے اپنی آنکھیں کھول دیں اور آہستگی سے پوچھا۔ "پروگرام؟ کون سا پروگرام؟ تمھیں معلوم ہے کہ میں چھے مہینوں میں ایک سے زیادہ کسی عوامی پروگرام کی اجازت نہیں دیتا اور تم نے ابھی کچھ ہفتے پہلے ہی تو ایک پروگرام کیا ہے"۔

شروتی نے سوچا کہ کاش اس نے اس سلسلہ میں کچھ کہا ہی نہ ہوتا۔

"اچھا تو بتاؤ کہ یہ کون سا پروگرام ہے؟"

"یہ کوئی سولو پروگرام نہیں ہے۔ مجھے ایک گروپ کے ساتھ کام کرنا ہے" شروتی نے جس قدر ممکن تھا سنبھل سنبھل کر بتانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کیا؟ ایک آرکیسٹرا؟" نبین ماسٹر نے بڑی حیرت سے دیکھا "لیکن تم تو ایک تنہا بجانے والی موسیقار یعنی ایک سولو آرٹسٹ ہو۔ تم ایک گروپ میں کیسے دھن بجاؤ گی؟"

یہ ایک ملا جلا گروپ ہے جس میں اویناش اور پیٹر اور اقبال اور من پریت اور......
......" کہتے کہتے وہ اچانک رک گئی۔

راگ الاپ اور تان کے اس گھر میں ملے جلے کا لفظ ہی برے معنی میں استعمال کیا جاتا تھا۔ نبین ماسٹر ایک ایسے فنکار تھے جو کلاسیکل موسیقی کی روایت کو ممکنہ حد تک خالص رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنی بیٹی کو غضب ناک نگاہوں سے دیکھا۔

پروگرام اگلے ہفتہ ہونے والا ہے" شروتی نے کہا۔

"اور اگر میں منع کردوں تو تم ملی جلی دھن نہیں بجا سکو گی۔ تب تم کیا کرو گی؟" نیلن ماسٹر نے پوچھا۔ ان کی انگلیاں کرسی کے ہتھے کو تھپ تھپا رہی تھیں۔

شروتی نے پچھلے مہینے کئی راتیں اسی خیال میں جاگ کر گزار دی تھیں کہ وہ اس خطرناک صداقت کو اپنے پاپا سے کس طرح کہہ سکے گی اور انھوں نے انکار کردیا تو وہ کیا کرے گی۔

سب سے پہلے طبلہ نواز اویناش نے اس سے ایک مخلوط بینڈ پر دھن بجانے کا خیال ظاہر کیا تھا۔ وہ خود ہارمنی نامی ایک گروپ میں انگلیوں سے ساز بجاتا تھا۔ انھیں ایک موسیقار کی ضرورت تھی جو راگ راگنیوں کا ماہر ہو اور جو ساز پر پیٹر کا ساتھ دے سکے۔

شروتی نے چھپ چھپا کر مشق میں حصہ لیا تھا جہاں وہ اسکول سے سیدھی من پریت کے گھر ممی سے یہ بہانہ کرکے جاتی تھی کہ وہ کلاس کے بعد سائنس ٹیچر سے کوچنگ لے رہی ہے۔ اسے مغربی دھنوں کے دائرہ میں راگوں کو بجانا پسند تھا۔ وہ مسحور ہو جاتی تھی جب پیٹر کی دھنیں وائلن پر خود اس کے راگوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو جایا کرتی تھی۔

پروگرام اگلے ہفتہ تھا۔ اس کا پورا وقت اپنے پاپا اور گرو کا سامنا کرنے اور ان سے اجازت حاصل کرنے میں صرف ہوا تھا۔ اب اگر انھوں نے منع کیا تو وہ کیا کرے گی؟

"میں نے تم سے ایک سوال کیا تھا" پاپا نے کہا "میں جواب کا منتظر ہوں"

" مجھے امید ہے کہ آپ منع نہیں کریں گے"۔ شروتی نے دھیمے لہجہ میں کہا۔ "اگلے ہفتہ کے پروگرام کے لیے گروپ پوری طرح مجھ پر منحصر ہے"۔

"ملی جلی دھنوں کے بارے میں تم میرے خیالات سے واقف ہو۔ میں اس بارے

میں اس مکان میں کافی کچھ کہہ چکا ہوں"۔

نبین ماسٹر کی اس طرز موسیقی کو جس کا وہ "میوزک" کے نام سے مذاق اڑاتے تھے سبھی کو علم تھا انہیں پختہ یقین تھا کہ ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کو دوسری قسم کی موسیقی کے ساتھ کبھی ملانا نہیں چاہتے۔ اور یہاں تو ان کی اپنی بیٹی کسی بینڈ میں 'فیوژن ویوژن' بجانے کی خواہش مند تھی۔

"پاپا"۔ شروتی نے ایک گہری سانس لے کر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں جانتی ہوں اور آپ کے خیالات کا احترام کرتی ہوں۔ لیکن جیسا آپ سوچتے ہیں ویسا نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ کل آپ خود مشق کو کیوں نہ سنیں؟"

"مشق، ہا" نبین ماسٹر نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ اور اس سوال کو سلجھائے ہوئے بغیر کہ شروتی کو بینڈ میں بجانا چاہیے یا نہیں اٹھ کر غصہ میں کمرے سے باہر نکل گئے۔

"کیا معاملہ ہے؟" لیلا دیوی نے پوچھا۔ وہ کمرہ میں اس وقت داخل ہوئی تھیں جب نبین ماسٹر غصہ کا اظہار کر رہے تھے۔

شروتی نے انھیں سارا قصہ کہہ سنایا۔

"اچھا تو وہ ایکسٹرا کلاسوں کا یہ معاملہ تھا"۔ اس کی ممی نے شروتی کی بات ختم ہوتے ہی کہا۔

"ممی، میں اس جھوٹ کے لیے شرمندہ ہوں"۔ شروتی نے کہا "دراصل میں ڈرتی تھی"۔

"میں سوچتی ہوں کہ تمھیں پروگرام میں حصہ لینے کا وعدہ کرنے سے پہلے اپنے گرو سے اجازت حاصل کرنی چاہیے تھی"۔ لیلا نے کہا۔
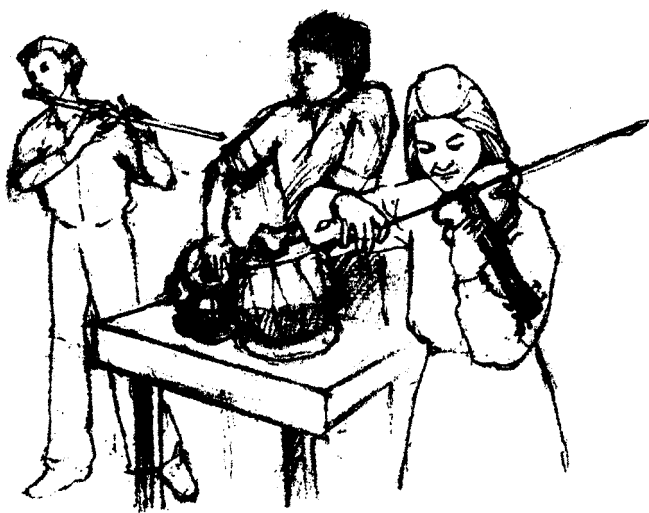
"میں جانتی ہوں کہ مجھے پہلے ہی پوچھ لینا چاہیے تھا۔ اگر اب مجھے ساز بجانے کی اجازت نہ ملی تو معلوم نہیں بینڈ کا کیا ہوگا"۔

"لیلا دیوی نے اپنی اکلوتی بیٹی کی طرف دیکھا جس کا خاموش اور خوب صورت بادامی چہرہ، نمایاں ٹھوڑی اور حساس منہ کے ساتھ پریشان نظر آرہا تھا۔

"سونے کا وقت ہو گیا ہے"۔ لیلا دیوی نے کہا۔ چلو اب وقت ضائع نہ کرو۔

اگلے روز اسکول کے لیے کپڑے تبدیل کرتے ہوئے شروتی نے سوچا کہ "میں پیٹر اور دوسروں سے جا کر کہہ دوں گی کہ میں ان کے ساتھ ساز نہیں بجا سکتی"۔

رات اس نے کروٹوں میں گزاری تھی۔ اسے بار بار اپنے پاپا کا چہرہ یاد آرہا تھا کہ جب اس نے ملے جلے بینڈ میں حصہ لینے کے اپنے فیصلہ سے آگاہ کیا تھا۔ وہ ناراض ہو گئے تھے اور ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچی تھی۔ دراصل وہ اپنے پاپا کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتی تھی۔ بینڈ کے لیے تو کوئی اور بھی مل جائے گا۔
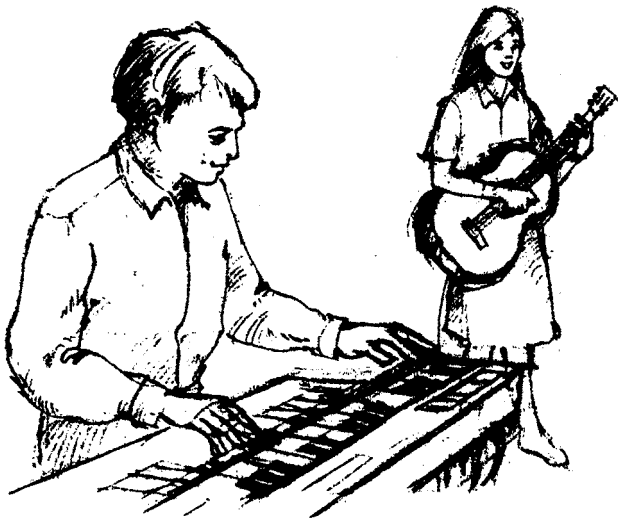
دوسرے سبھی لوگ من پریت کے گھر پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"کیا اجازت مل گئی؟" جیسے ہی شروتی کمرے میں داخل ہوئی تو من پریت نے پوچھا۔ اگر چہ من پریت کی عمر اس سے دو سال زیادہ تھی لیکن شروتی اسے ایک دوست ہی سمجھتی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ پیٹر، اقبال، اونیاش اور من پریت سبھی اس کے لیے موسیقی میں حصہ دار ہونے سے بھی کچھ زیادہ ہی قریب ہو گئے تھے۔ وہ اس کے دوست بن گئے تھے۔ لیکن اب اس کی یہ دوستی بھی ختم ہو جانے والی تھی۔

"اس کے بارے میں ہمیں بعد میں بتانا" پیٹر نے کہا۔ وہ مضبوط قویٰ کا جوان تھا جو ساز کے تاروں کو اِدھر اُدھر چھیڑ رہا تھا۔ اونیاش اپنے طبلہ کی تھاپ درست کر رہا تھا۔ شروتی نے طے کیا کہ اپنی علیحدگی کا اعلان کرنے سے پہلے وہ ان کے ساتھ آخری بار ساز بجائے گی۔

وہ اپنے کام میں روزمرہ کی مانند کسی ٹیم میں سخت محنت کرنے والوں کی طرح

مصروف ہوگئے۔ شروتی نے ساز بجاتے ہوئے ایک تماشائی کی طرح سنا۔ راگ اور مغربی طرز ولز ساتھ ساتھ بج رہے تھے اور ہر موسیقی اپنی جگہ صاف پہنچائی جارہی تھی۔

جیسے ہی گروپ نے مشق ختم کی کمرہ پرجوش تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔

شروتی نے چاروں طرف دیکھا۔ وہ اس سے واقف نہیں تھی کہ من پریت کے کمرہ میں کوئی اور بھی موجود تھا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ وہاں اس کے والدین کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ ہاں نبین ماسٹر اور لیلا دیوی دروازہ کے قریب بیٹھے پرجوش تالیاں بجا رہے تھے۔ اس کے پاپا جو روایت پسند فنکار تھے اب دوسری ٹیم کے ممبروں کو ان کی موسیقی پر زبردست مبارک باد پیش کر رہے تھے۔

''واہ واہ بہت خوب۔ بہت خوب'' وہ پرجوش لہجہ میں کہہ رہے تھے۔

اب نبین ماسٹر نے اس کے پاس آکر کہا ''شروتی بہت اچھا کیا کہ تم نے راگ کو اس کے صحیح جذبہ کے ساتھ ہم آہنگ رکھا''۔

بینڈ کے دوسرے ممبر احسان مندی سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نبین ماسٹر کے الفاظ واقعتہً بڑے تعریفی تھے۔

آخر اس کے پاپا میں یہ تبدیلی کیوں کر واقع ہوئی؟ خوشی کے دوران بھی وہ اسی معمہ کو حل کرنے میں مصروف تھی۔

''تمہارا شو یقیناً کامیاب رہے گا''۔ نبین ماسٹر نے کہا۔ ''یہ اگلے ہفتہ ہی ہے نا، لیلا!'' انھوں نے شروتی کی ممی کی طرف مڑ کر کہا ''ہمیں اس کا یقین کرنا چاہیے کہ شروتی اپنی سبھی مشقوں کو جاری رکھے گی''۔ انھوں نے دوسروں کی طرف مڑ کر کہا۔ ''کیوں نہ تم میوزک اسکول میں یہ مشقیں کرو میرے خیال میں تم سبھی کے لیے سہولت رہے گی''۔

گھر واپس ہوتے ہوئے سڑک پر راستہ بھر شروتی خاموش رہی۔

"اگرچہ کلاسیکی موسیقی کے روایتی انداز کو میں ہمیشہ ترجیح دوں گی لیکن پاپا میں بہت خوش ہوں کہ آپ نے ملے جلے پروگرام میں بھی ساز بجانے کی اجازت دے دی"۔

سبین ماسٹر عام طور سے بہت کم کھلنے والے والدین میں سے تھے، پھر بھی انھوں نے بڑی شفقت اور محنت سے اپنی بیٹی کو کلاسیکی موسیقی سکھائی تھی۔ تاہم اب انھوں نے اپنا ہاتھ نرمی سے شروتی کے کاندھے پر رکھا اور اپنے ساتھ چلتی ہوئی لیلا دیوی کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمی آواز سے کہا" یہ تمہاری ممی ہی تھیں جنھوں نے میری آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنے ماضی کو بھول گیا تھا"۔

شروتی سارا معاملہ سمجھ گئی۔ برسوں پہلے خود سبین ماسٹر نے روایت شکنی کی تھی۔ ان کے والد، دادا اور چچا روایتی موسیقی کے دلدادہ تھے۔ بڑی پریشانیاں اٹھا کر انھوں نے موسیقی کے ورثہ کی لَو کو اچھے اور برے دنوں میں روشن رکھا تھا۔

سبین ماسٹر نے خود اپنے والد کی آواز کو قائم رکھنے کے بجائے ایک مغربی ساز اپنا کر انھیں ناراض کر دیا تھا۔ اس وقت وائلن ہندوستانی کلاسیکی موسیقی میں ضم نہیں ہوا تھا۔ شروتی کے دادا نے اس مغربی ساز سے اپنے بیٹے کی قربت کو ایک طرح کی بغاوت قرار دیا تھا۔

"میں نے خود اپنی موسیقی کی طاقت کو کمتر سمجھا" سبین ماسٹر نے اپنی بیٹی سے کہا"۔ میں ڈر گیا تھا کہ کہیں تم ہم سے بچھڑ نہ جاؤ۔ لیکن اب میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے اندیشے بے بنیاد تھے"۔

شروتی جذبات مسرت میں اپنے والدین سے چمٹ گئی۔ بینڈ سے مشق کے دوران ابھی ابھی ختم ہونے والے نغمہ کی بازگشت کو سنتے ہوئے وہ تینوں گھر واپس ہو گئے۔

یہ کس کا کام ہے؟

روی نے اُما کے کمرے میں سر ڈال کر جھانکتے ہوئے کہا۔ "ارے میں بھوک سے تڑپ رہا ہوں۔ کیا تم مجھے کھانے کے لیے کوئی چیز نہیں دے سکتیں"۔

اُما نے جواب دیا "میں مصروف ہوں۔ کل میرا ریاضی کا امتحان ہے اور مجھے مستقل پڑھنا ہے"۔

"اتنی خود غرض نہ بنو۔ میں گھنٹوں کرکٹ کھیلنے کے بعد گھر آرہا ہوں اور ممی باہر گئی ہوئی ہیں"۔

"اچھا اچھا ٹھہرو میں تمہارے لیے کوئی چیز لاتی ہوں"۔ اُما نے اپنی ریاضی کی کتاب بند کی اور اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس طرح تو وہ امتحان میں فیل ہو جائے گی۔ دروازوں پر دستکوں کا جواب دیتے دیتے، ملازموں کی نگرانی کرتے اور فون کی گھنٹیوں پر بات کرتے کرتے اس کے پاس پڑھائی کرنے کے لیے وقت ہی نہیں بچے گا۔ البتہ وہ اس بات سے خوش تھی کہ اس کی ممی دن بھر کے لیے اپنی ایک سہیلی کے یہاں گئی ہوئی تھیں۔ وہ دن بھر گھر کے کاموں میں الجھی رہتی تھیں۔اور باہر جانے کے لیے وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ اس لیے ایک پورا دن باہر رہنا ہی ان کے لیے مفید تھا۔

اس دن صبح اس کی ممی نے فکر مندی کے ساتھ کہا تھا "دروازہ کو بند کرنا نہ بھولنا۔ اور اپنا کھانا وقت پر کھالینا اور......"

"ممی میں پندرہ سال کی ہو گئی ہوں" اُمانے احتجاجاً کہا "میں جانتی ہوں کہ مجھے اپنا خیال کیسے رکھنا چاہیے"۔

"میں بھی جانتی ہوں" مسز ملک مسکرائیں۔ تم بہت لائق بیٹی ہو۔ اس لیے تو میں دن بھر کے لیے گھر کو تم پر چھوڑ کر جا رہی ہوں"۔ انھوں نے مزید کہا۔ "دیکھو گیس کے سلینڈر کا سوئچ بند کر دینا۔ اور روی کو کھانا دینا یاد رکھنا اور......"

"میں اسے کھانا کیوں دوں؟ اُمانے چڑ کر کہا"۔ وہ سولہ برس کا ہو گیا ہے۔ کھانا خود کھانے کے لائق تو ہو ہی گیا ہے۔ تم اس سے اتنا لاڈ پیار کیوں کرتی ہو؟ وہ نہ تو گھر پر کوئی کام کرتا ہے اور نہ ہی کھانا بنانا جانتا ہے"۔

"ہاں ہاں" مسز ملک نے جواب دیا۔ "ہمیں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہیے۔ مجھے تیار ہونا ہے"۔

اُما مایوس ہو کر وہاں سے چلی گئی۔ اس کی ممی ہمیشہ اسی طرح بات ختم کر دیا کرتی تھیں۔ یہی ایک ایسا معاملہ تھا جس کے بارے میں اُما سنجیدگی سے سوچا کرتی تھی۔ ان کا کنبہ چھوٹا سا تھا۔ اُما کا گھر میں جو کردار تھا اس نے اس کے خلاف احتجاج کرنا شروع کر دیا تھا۔

صبح کے وقت اسکول جانے سے پہلے ناشتہ تیار کرنے میں اپنی ممی کی مدد کرنی پڑتی تھی۔ بستر ٹھیک کرنے پڑتے تھے اور ٹفن تیار کرنا پڑتا تھا۔ شامیں پڑھائی کرنے اور گھر کے کاموں بٹ جاتی تھیں۔ جب سبزی ترکاریوں یا سامان کی ضرورت ہوتی تھی یا کوئی چیز ختم ہو جاتی تھی تو ایسے وقت اُما ہی کی پکار ہوتی تھی۔ اگرچہ اسے اپنی ممی کے ساتھ گھر کی ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹانا پسند تھا لیکن روی کا گھر میں فضول رہنا اور اپنا ہر کام کروانے کی توقع رکھنا بہت کھلتا تھا۔

"صبح کے وقت روی خود اپنا بستر کیوں ٹھیک نہیں کرتا؟" وہ اپنی ممی سے پوچھتی۔ "وہ اپنے کپڑوں پر پریس کیوں نہیں کرتا اور ان کی تہہ ٹھیک کیوں نہیں کرتا؟"

مسز ملک نے، جو گھر میں لڑکی کے کاموں سے متعلق اپنے علیحدہ خیالات رکھتی تھیں، کبھی روی کو گھریلو کاموں میں الجھانے کی کوشش نہیں کی۔ اُما نے محسوس کیا کہ دو سال پہلے اس کے پاپا کی موت کے بعد معاملات بد سے بدتر ہو گئے تھے۔ کیوں کہ اُما کی ذمہ داریوں میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اس کی ممی ہمیشہ اس کی تعریف کرتی رہتی تھیں۔

"میں نہیں جانتی کہ میں اُما کے بغیر کیا کروں گی"۔ وہ اپنی سہیلیوں سے کہا کرتی تھیں۔ "وہی تو پورا گھر چلا رہی ہے اور میرے لیے بڑی مددگار ثابت ہو رہی ہے"۔ تاہم روی اسی طرح کاہل بنا رہا اور اپنی دلچسپیوں میں مصروف رہا۔

اُما روی کے لیے سینڈوچ بنا کر اس کے کمرے میں لے گئی۔ "تم خود انہیں بنانا کیوں نہیں سیکھ لیتے؟" اس نے کہا۔ "تمہیں بریڈ پر مکھن یا جیم ہی تو لگانا ہے۔ یہ کون سا مشکل کام ہے؟"

یقیناً میں یہ کام کر سکتا ہوں" روی نے بے پروائی سے کہا۔ "لیکن یہ کام عورتوں کا ہے۔ میں اپنا وقت کچن میں ضائع نہیں کر سکتا"۔

اُما غصہ سے بپھر گئی۔ "اچھا تو تم سمجھتے ہو کہ میرے پاس ضائع کرنے کے لیے بہت سا وقت ہے؟"

اس نے چلا کر کہا۔ "کل میرا امتحان ہے اور تمہارے لیے سینڈوچ بنانے میں پندرہ منٹ لگ گئے اور......"

"مجھ سے اس طرح بات نہ کیا کرو!" روی نے کہا۔ "یاد رکھو کہ میں تمہارا بڑا بھائی ہوں، تمہیں مجھ سے عزت کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔ میری خدمت کرنا تمہارا فرض ہے"۔

اُما پیر پٹختی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ روی نے سینڈوچ کے لیے اس کا شکریہ تک ادا نہیں کیا تھا۔ اُما نے اپنا سر جھٹک کر

اپنے آنسو خشک کیے۔ اتنی چھوٹی سی بات پر اسے اپنا امتحان خراب نہیں کرنا چاہیے۔ آخر اس معاملہ میں اپنے بھائی کے ساتھ پہلی بار تو ایسا ہوا نہیں تھا۔

ایک ہفتہ بعد اُما کو ڈرامہ میں ایک اہم کردار کے لیے چُن لیا گیا جس کا نام "موسیقی اور جادو" تھا اور جسے اسکول میں کھیلا جانا تھا۔ یہ ایک ایسی لڑکی کا کردار تھا جو ایک روز بارش میں بھیگتے ہوئے جادوئی معاملہ میں ملوث ہو جاتی ہے۔ اُما اس سلسلہ میں بہت پر جوش تھی۔

ڈرامہ ٹیچر مسز شری نو اس نے اس سے پوچھا "کیا تم آج اسکول کے بعد ٹھہر سکتی ہو؟ میں جانتی ہوں کہ بہت کم وقت پر کہہ رہی ہوں لیکن میں تمہارے رول کے دوران تمہارے لنچ کا انتظام کر دوں گی۔ تم جانتی ہو کہ ڈرامہ میں کُل دو ہفتے باقی رہ گئے ہیں۔ تم میرے ساتھ چلو اور فون کر کے اپنے والدین کو اس بارے میں مطلع کر دو"۔

اُما ہچکچائی۔ اس کی ممی کو دن کا وقت اپنی ایک سہیلی کے ساتھ تو ہسپتال میں بتانا تھا اور اس لیے انھوں نے روی کا خیال رکھنے کی اُما کو ہدایت کی تھی۔ اب اسے کیا کرنا چاہیے؟ تبھی اس نے سوچا کہ روی کو اپنا کام خود کرنے کا اچھا موقع تھا۔ اس لیے اس نے روی کو فون پر اپنے بارے میں اطلاع دے دی اور اس کا جواب سننے سے پہلے ہی رسیور رکھ دیا۔

"لنچ کا کیا ہوگا؟" روی نے رسیور میں کہا لیکن ڈائل ٹون بجنے لگی۔ کچن میں دوڑ کر اس نے کھانا تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ایک ڈش میں کچھ بھیگے چاول رکھے ہوئے تھے اور کئی خالی برتن رکھے ہوئے تھے۔ اُما نے جلد ہی گھر واپس ہو کر سادہ سا کھانا بنانے کا ارادہ کیا تھا لیکن اب ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ روی نے ریفریجریٹر کو ٹٹولا لیکن اس میں بھی دو کٹورے دہی اور کچھ کچی سبزیوں کے علاوہ کچھ موجود نہیں تھا۔ نہ مکھن تھا اور نہ ہی بریڈ تھی۔ ان چیزوں کو شام میں اُما ہی خرید کر لانے والی تھی۔

روی غصّے میں سرخ ہو گیا۔ اس کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے اور وہ خلا میں گھورنے لگا۔ بھیگے چاولوں کا کیا کیا جا سکتا تھا۔ اس نے انگلیوں سے ریفریجریٹر میں رکھے ہوئے دو انڈے توڑے۔ کیا انڈے توڑ دینے سے ہی آملیٹ بن سکتا تھا یا انھیں پکانا بھی ہوگا؟ اس نے ان دونوں میں سے کسی بھی صورت کو اختیار نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

اسے وقتی طور پر بھوک مٹانے کے لیے ایک پیالی چائے کی خواہش تھی۔ کوشش کے بعد اسے چائے کی پتّی مل گئی اور کچھ دودھ اور شکر بھی نظر آگئے لیکن اسے انھیں ملا کر چائے بنانا نہ آیا۔ مجبور ہو کر اس نے چاولوں کے دانے چبا لیے لیکن فوراً ہی انھیں اگل دیا۔ اس نے اس سے پہلے ایسی بھیانک چیز نہیں چکھی تھی۔ صوفہ میں دھنستے ہوئے اس نے بھوک کے سبب بڑی کمزوری محسوس کی۔ اُما نے اسے اس حالت تک پہنچا کر بہت برا کیا تھا۔ وہ ضرور ممی سے شکایت کرے گا اور مارکیٹ کا خیال آتے ہی وہ اچھل پڑا۔ لیکن پیسے نہ ہونے کا خیال آتے ہی اس کا جوش سرد پڑ گیا۔

شام کے پانچ بجے اُما گھر واپس ہوئی۔ کنجی سے قفل کھول کر جب وہ اندر داخل ہوئی تو روی کو صوفہ پر دراز دیکھ کر اسے بڑی حیرت ہوئی۔

"ارے تم کرکٹ کھیلنے کے لیے نہیں گئے؟ اس نے مسرور لہجے میں کہا" تمہارے سارے دوست باہر موجود ہیں"۔ صوفہ میں سے آواز ابھری "اُما میں مر رہا ہوں۔ مہربانی کر کے مجھے کھانے کے لیے کچھ دے دو......"۔

اپنے بھائی کا یہ ڈرامائی انداز دیکھ کر اُما نے بہ مشکل اپنی ہنسی ضبط کی اور فوراً کچن میں پہنچ گئی۔ بیس منٹ بعد روی آملیٹ سے بھری پلیٹ، تازہ سلاد اور آلو کے شوربے پر ٹوٹ پڑا تھا۔ بعد ازاں عام حالت میں آنے میں وہ واپس جا بیٹھا اور اُما سے بولا۔

"تم میری زندگی بچانے والی دیوی ہو، تمہارا بہت بہت شکریہ" اُما نے اسے صوفہ

سے اٹھتے ہوئے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا"۔

"کیا کرکٹ کھیلنے جا رہے ہو؟"

"نہیں" روی نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا" میں کچن میں جا رہا ہوں اور تم مجھے چیزیں پکانا سکھاؤ گی"۔

ایک گھنٹہ بعد جب مسز ملک گھر واپس ہوئیں تو انھوں نے اپنے بچوں کو رات کا کھانا بنانے میں مصروف پایا۔

"روی" اپنے بیٹے کو گرم جوشی کے ساتھ کرم کلہ تراشتے ہوئے دیکھ کر وہ پر جوش ہو کر چلائیں۔ "یہ تم کیا کر رہے ہو؟ کیا......؟"

روی نے مڑ کر دیکھا۔ "ممی میں کھانا بنانا سیکھ رہا ہوں۔ اگر میں نے یہ پہلے سیکھ لیا ہوتا تو آج تقریباً مرنے سے بچ جاتا"۔

"لیکن ......" مسز ملک نے کہنا شروع کیا ہی تھا کہ روی نے آج کا وحشت ناک تجربہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ "نہیں ممی۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے کم از کم زندہ رہنے کے لیے کھانا بنانا آنا چاہیے۔ آپ اور اُما ہمیشہ تو میری نگہداشت نہیں کر سکتیں۔ ٹھیک ہے نا اُما؟"

مسز ملک اپنے کاندھوں کو جھٹکا دے کر مسکرا دیں۔ جو کچھ ان کا بیٹا کہہ رہا تھا اس میں صداقت تھی۔

"میرے خیال میں تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو؟" انھوں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

اُما نے روی کا ہاتھ دبایا اور آنکھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یقیناً وہ ٹھیک کہہ رہا ہے"۔
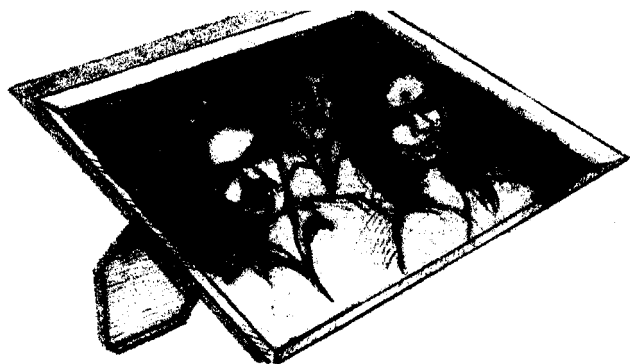
پیار آ ہی گیا

تھنگامنی

گھر میں بہت سکون ہے۔ میں ٹی۔وی پر اپنا پسندیدہ کوئز شو دیکھ رہا ہوں۔ ڈیڈی اپنے کتابوں کے ڈھیر میں بیٹھے گنگنا رہے ہیں، جو انھوں نے اپنی کتابوں کے شیلف سے نکالی ہیں۔ جب بھی کوئی پسندیدہ کتاب پا لیتے ہیں تو اسے اطمینان سے پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔

تبھی ممی اندر داخل ہوتی ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں ٹوٹی ہوئی پریس ہے وہ بہت ناراض نظر آتی ہیں۔

"کیا تم کتابیں پڑھنے کے علاوہ بھی کوئی کام کر سکتے ہو؟ کاش تم گھر کا کام کاج بھی کر سکتے!"

ڈیڈی جواب نہیں دیتے ہیں۔ اگر وہ جواب دیتے تو ممی کی طرف سے ایک تازہ تقریر شروع ہو جاتی۔ اس لیے وہ پڑھنے میں مشغول رہتے ہیں۔ ان کا گنگنانا موقوف ہو جاتا ہے لیکن وہ کتاب پر اپنی گرفت مضبوط کر لیتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ کتاب کے پیچھے ان کا منھ بھنچ گیا ہوگا اور آنکھیں سخت ہو گئی ہوں گی۔ سدھارتھ بسو اپنے ریپڈ فائر راؤنڈ میں ہے لیکن سوالات کی طرف توجہ نہیں دے پا رہا ہوں۔ میں اپنی آنکھیں ٹی۔وی کے پردے پر مرکوز رکھتا ہوں۔ وہ بات نہیں کر رہے ہیں لیکن تناؤ خاصا ہے۔ کاش ممی کمرے سے نکل جاتیں۔ لیکن مجھے حسرت ہی رہی۔

"میں تم ہی سے بات کر رہی ہوں۔ جاؤ اور اسے درست کرالاؤ۔ اور جب جا ہی رہے ہو تو پینٹ کرنے والے کا انتظام بھی کرتے آنا۔ گھر کی سفیدی ہوئے تین سال ہو چکے ہیں"۔

ڈیڈی ایک ٹھنڈی آہ کے ساتھ کتاب بند کر دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔

"سریتا میں یہ سارے کام اتوار کو کر دوں گا۔ پہلے میں یہ ساری کتابیں الگ رکھ دوں"۔

میں کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ سیدھا رکھے میرے کندھے تن گئے تھے اور سر ضربوں سے چور تھا۔ کیا انھیں گھر میں دوسرے رہنے والوں کا کوئی خیال نہیں۔ میں اٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور ٹی۔ وی کا سوئچ آف کر دیتا ہوں۔

میرا خیال ہے کہ کھلی جنگ کا دن ہے۔ کچھ دن ایسے بھی ہوتے ہیں جب یہ جوڑا ایک دوسرے سے بات تک نہیں کرتا۔ ایک لفظ بھی منھ سے ادا نہیں کرتا۔ ممی کھانا بنا کر میز پر لگا دیتی ہیں ڈیڈی اسے کھا کر سو جاتے ہیں۔ رات کے کھانے پر شاندار گفتگو ہوتی ہے۔ وہ باری باری سے مجھ سے بات کرتے ہیں۔

"آج تمہارا امتحان کیسا رہا؟" ڈیڈی پوچھتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ میں جواب دوں ممی درمیان میں بول پڑتی ہیں "جانتے ہو تمہارا بالوں کا نیا طرز بہت خوب ہے"۔ وہ اس طرح تعریف کرتی ہیں جسے انیس سال سے کم عمر کے بچے پسند کرتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ میں ان کی طرف متوجہ ہوں ڈیڈی کوئی اور بات کہہ دیتے ہیں لیکن وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ میں ان کا جواب دیتا ہوں یا نہیں۔

"تم نے دیکھا سمیر انے اگاسی کو کس طرح پھٹکارا" ڈیڈی بالکل غیر متعلق بات کی طرف رخ موڑ دیتے ہیں۔

وہ میرے والدین ہیں۔ دونوں ہی راستہ سے بھٹک جاتے ہیں۔ وہ مجھ سے پیار کرنے کا مظاہرہ کرتے ہیں میرے متفکر والدین ہونے کا۔ کوئی ان سے کہہ دے

کہ اگر وہ ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دے سکتے تو ان کی یہ فکر بے کار ہے۔ اور یہ کہ میں تحفظ کی ضرورت محسوس کرتا ہوں لیکن کسی ایسے کھلونے کی طرح نہیں جسے دونوں طرف سے کھینچا جاتا ہے۔

اپنے ہمسایہ میں میرا اپنا کوئی دوست نہیں ہے۔ میں اس کے لیے خدا کا شکر ادا کرتا ہوں ورنہ میں مارے شرم کے مر جاتا۔ پڑوسی ان کے جھگڑے سن سکتے ہیں باہر جاتے ہوئے میں اپنی کمر میں کئی آنکھیں محسوس کرتا ہوں میں انھیں "بیچارہ لڑکا" کہتے ہوئے سن سکتا ہوں۔

☆☆☆☆

بہت پہلے ہم ایک خوش باش کنبہ کے آفراد تھے۔ ان دنوں ممی ملازمت کرتی تھیں۔ میں پرائمری اسکول میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ پھر ممی نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ میں یہ سب بہت پسند کرتا تھا۔ جب میں اسکول سے واپس آتا تھا تو وہ گھر پر موجود ہوتی تھیں۔ مزیدار ڈشیں تیار کرتی تھیں، کام کرتے ہوئے گنگناتی جاتی تھیں اور خوب صورت لگتی تھیں۔ ممی اور ڈیڈی کبھی کبھی مجھے آنٹی کے پاس چھوڑ کر دفتر کے ساتھیوں کے ساتھ پارٹیوں میں چلے جایا کرتے تھے۔

مجھے یہ پسند نہیں تھا کیوں کہ ان پارٹیوں سے واپس آکر ممی اداس ہو جایا کرتی تھیں۔ پھر جلدی ہی وہ بدل گئیں۔ چلّانے لگیں اور انھوں نے مسکرانا اور ہمیں گلے لگانا بھی چھوڑ دیا۔ اب رات کے کھانے کی وہ خوشیاں نہ رہیں جب ہم دن بھر کی غپ شپ سے جی بہلایا کرتے تھے۔ ان کا مذاق عامیانہ ہوتا تھا جسے وہ میرے ساتھ کیا کرتی تھیں۔ اس کے باوجود ان دنوں یا تو وہ دھمکاتی رہتی تھیں یا اداس ہو جاتی تھیں۔

"روہت اخباروں کو پڑھنے کے بعد دور رکھ دینا" ممی ڈیڈی کو برا بھلا کہتے ہوئے حکم دیا کرتی تھیں۔ عام طور سے بغیر سوچے سمجھے وہ خود ایسا کر دیا کرتے تھے لیکن اب وہ ڈپٹ دیتے تھے کہ "تم ہی خود ایسا کیوں نہیں کر دیتیں؟ تم تو سارے دن گھر پر ہی رہتی ہو"۔

"میں نے تمہارے کاموں کے لیے ملازمت ترک نہیں کی ہے"۔ وہ چلاتیں۔
وہ ناراض، پریشان اور افسردہ ہو جایا کرتی تھیں۔ وہ جس قدر چلاتی تھیں ڈیڈی اسی قدر خاموش ہو جاتے تھے۔ وہ اکثر کتابوں میں کھو جاتے تھے۔ بعض اوقات وہ خود بھی چیخ پڑتے تھے جو ایک بری بات تھی۔ لڑائیاں جاری رہیں۔

اس دن میں دیوار اور صوفہ کے درمیان کونے میں اپنی پڑھنے کی پسندیدہ جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ میرے والدین بھی کمرے ہی میں تھے۔ ممی ٹی۔ وی دیکھ رہی تھیں اور ڈیڈی پڑھ رہے تھے۔ اچانک ممی نے کہا "میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے کیوں نفرت کرتے ہو۔ اس لیے کہ میں نے ملازمت چھوڑ دی ہے اور پیسے لانے بند کر دیے ہیں تمھارے دفتر کی ان عورتوں کی طرح جن کی تم اس قدر تعریف کرتے ہو"۔

"دیکھو احمق نہ بنو، سریتا۔ مجھے اس سے ذرا بھی فرق نہیں پڑتا کہ تم کام کرو یا نہ کرو۔ یہ تم ہی تھیں جو آدتیہ کے ساتھ اپنا زیادہ وقت گزارتی تھیں"۔ ڈیڈی نے کہا۔ انھوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ میں وہاں موجود رہتا ہوں شاید انھیں اس کی پرواتھی بھی یا نہیں۔

"ارے اس گھر میں تو سارا قصور میرا ہی ہے۔ تم جھوٹے ہو۔ میں جانتی ہوں تم صرف انہی عورتوں کو پسند کرتے ہو جو کام کرتی ہیں"۔

یہ معاملہ اس قدر طول پکڑتا گیا کہ میں بھاگ کر اپنے کمرہ میں چلا آیا۔

بعد میں ممی بھی آگئیں۔ ان کا چہرہ چلاتے چلاتے پھول گیا تھا لیکن انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ جو کچھ بھی ہوا وہ اس کے لیے نادم تھیں۔ وہ مجھے اس قدر

اچھی اور پیاری لگیں کہ میں ان سے چمٹ گیا اور میں نے سوچنے کی کوشش کی کہ جیسے باہر کے کمرے میں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔
لیکن کوئی چیز بدلی نہیں۔ میں ہمیشہ کش مکش میں مبتلا رہا اور انتظار کرتا رہا کہ ان میں اب جھگڑا کب شروع ہوتا ہے۔ مجھے ان کے برتاؤ سے تکلیف ہونے لگی تھی۔ میں اب بھی ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے پیار موجود نہیں پاتا ہوں۔ ہم ایسے کنبہ کے افراد ہیں جو ایک دوسرے کو گلے سے لگا لیتے ہیں یا لگا لیا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں انھیں گلے لگتے دیکھ کر نرم ہو جایا کرتا تھا۔ مرا دل بھر جاتا تھا اور پھٹ جانا چاہتا تھا۔ اور بعض اوقات جب وہ گلے ملتے تھے تو خوش ہو اٹھتا تھا۔

☆☆☆☆

میں جب نشستگاہ میں موجودہ وقت میں آوازوں کو سنتا ہوں تو تشنجی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ میں اندھیرے میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا ہوں۔ کاش میں کہیں جا سکتا۔ میں چیختا جاتا ہوں۔ دروازہ کھلتا ہے اور ممی اندر داخل ہوتی ہیں "میں اب اور زیادہ برداشت نہیں کر سکتی"۔ وہ کہتی ہیں اور اچانک میرے لیے یہ سب کچھ بہت تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔
میری پیاری عقل مند ممی میری آنکھوں کے سامنے پوری طرح بدل گئی ہیں۔ وہ مجھ سے کیا توقع رکھتی ہیں کہ میں انھیں تسلی دوں؟ کم از کم ڈیڈی نہیں سمجھ سکتے کیا؟ وہ بھی کیوں لڑتے جھگڑتے ہیں؟
میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوتا ہوں "میں تم دونوں سے عاجز آچکا ہوں۔ میں یہاں بورڈ کے امتحان کی تیاری کر رہا ہوں لیکن اس کے لیے بھی نہ سکون میسّر ہے اور نہ تنہائی۔ آپ دونوں کیا اس قدر خود غرض ہیں کہ مجھے ایک کا دو بنا دیا ہے۔ آخری سوال ایک سسکی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور میں پہلے کمرے سے اور پھر گھر سے باہر بھاگ جاتا ہوں۔ رات کے ۹ ربجے کا وقت ہے۔
میں بھاگتا جا رہا ہوں۔ ان لوگوں کو دھوکا دیتے ہوئے جو یا تو گھر جا رہے ہیں یا کہیں

اور۔ صرف مجھ ہی کو کہیں نہیں جانا ہے۔ ایک طویل مدت کے بعد مجھے محسوس ہوتا ہے کہ سڑکیں خالی ہوتی جا رہی ہیں۔ اس کے باوجود میں بھاگتا جا رہا ہوں۔ مجھے کانکریٹ کا ایک ٹکڑا الگ جاتا ہے اور میں منھ کے بل گر پڑتا ہوں۔ میں فرش پر بیٹھ جاتا ہوں اور چیخنا چلانا شروع کر دیتا ہوں۔ یقین کیجیے کہ میرے والدین ذرا بھی میرے پکارنے کی پروا نہیں کرتے۔ میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ مجھ سے چھٹکارا پاکر خوش ہو رہے ہوں گے۔ وہ اور غیر موجود مسئلہ پر ان کی احمقانہ لڑائی۔ تبھی مجھے اپنے کندھے پر ایک ہاتھ محسوس ہوتا ہے۔ جو گلے لگنے میں تبدیل ہو جاتا ہے اور میں اس سے چمٹ جاتا ہوں وہ میرے ڈیڈی ہیں۔ انھیں سانس نہیں آرہی ہے اور مجھے احساس کر کے صدمہ پہنچتا ہے کہ وہ میرا ساتھ دینے کے لیے دوڑتے دوڑتے تھک گئے ہیں۔

''آدیتہ مجھے افسوس ہے۔ تمہاری ممی بددل ہو رہی ہیں۔ انھوں نے ملازمت اس لیے چھوڑی تھی کہ وہ دفتر اور گھر کے کام نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ تمہارے ساتھ رہنا چاہتی تھیں۔ لیکن اب جب کہ تم بڑے ہو گئے ہو وہ خود کو تنہا محسوس کرتی ہیں اور جب بھی وہ کسی کو کام کرتے ہوئے دیکھتی ہیں تو انھیں اپنی زندگی یاد آجاتی ہے۔ وہ یہ سوچنا شروع کر دیتی ہیں کہ میں ملازمت کرنے والی عورتوں کو چاہنے لگا ہوں''۔ میں نے سسکیاں لینا بند کر دیا ہے۔ میں اب بھی انھیں پکڑے ہوئے ہوں۔ ان کے چہرے پر داڑھی کے بال مجھے پسند ہیں اور ساتھ ہی ان کی خوشبو بھی۔

''آدتیہ کیا تم یقین کرو گے کہ ہم دونوں تم سے محبت کرتے ہیں اور جب ہم لڑتے جھگڑتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ ہم ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ ہم مسئلوں کو سلجھاتے ہیں۔ شاید وہ کوئی جز وقتی ملازمت کر لیں۔ جب تک وہ یہ نہ کر لیں کیا تم ہمارے ساتھ برداشت کر لو گے؟'' ان کی آواز بکھر جاتی ہے اور ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے ہیں۔

میں اب بھی پریشان ہوں لیکن اتنا بھی نہیں کہ یہ نہ دیکھ سکوں کہ وہ بھی پریشان

ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ممی بھی میرے لیے پریشان ہیں اور یہاں میں سوچ رہا ہوں کہ وہ میری پروا نہیں کرتے۔ مسئلے کس کے ساتھ نہیں ہوتے؟ مجھ پر ہر چیز کا ردعمل کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ کیا چیزیں بہتر ہو جائیں گی، ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔ اگر ممی نے ملازمت کر لی تو معاملات بدترین شکل بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ایک کنبہ کا ساتھ ساتھ چلنے سے ہے۔ اگر کوئی ممبر گر جائے تو دوسروں کو چاہیے کہ وہ اسے اٹھائیں۔ میں نے اس کا احساس کب کیا؟ مجھے نہیں معلوم۔ پتہ کی بات تو یہ ہے کہ ہم محبت کریں اور جینے دیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ مجھے یہ روشنی سڑک پر ہی حاصل ہوئی۔

اچانک میں ایک روشنی محسوس کرتا ہوں۔ جو میرے چہرے پر پڑی ہو گی کیوں کہ ڈیڈی کی گرفت مجھ پر مضبوط ہو گئی ہے۔

"قلفی کھانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ ممی کو یہ بہت پسند ہے"۔ وہ کہتے ہیں میں اچھل پڑتا ہوں اور ہم ہاتھ میں ہاتھ دیے آئس کریم پارلر کی طرف چل پڑتے ہیں۔
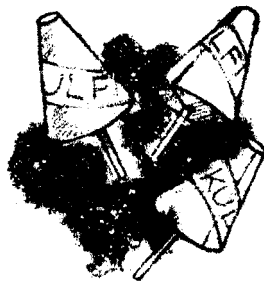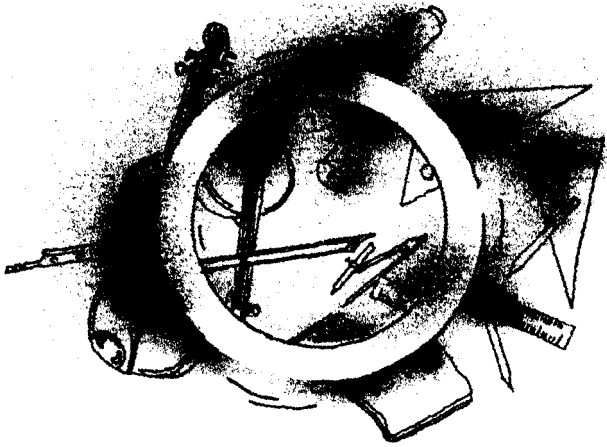
دہری مشکل

گرجارانی استھانا

امبر اسکول بس سے نیچے کود کر اپنے گھر کی طرف دوڑ پڑا۔ "اف یہ بدبخت ایکسٹرا کلاسیں! چار پانچ بج چکے ہیں اور ڈیڈی ساڑھے پانچ بجے دفتر سے واپس آجائیں گے۔ مجھے مشق کرنے کے لیے صرف ایک گھنٹہ باقی رہ گیا ہے" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "اتنی ذرا سی مشق کے سبب مجھے مقابلہ میں حصہ لینے کا خیال ترک کر دینا چاہیے"۔

وہ پانچ منٹ میں گھر پہنچ گیا اور بے صبری سے دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے اس وقت تک گھنٹی پر سے انگلی نہیں ہٹائی جب تک کہ اس کی ممی نے دروازہ نہیں کھول دیا۔

"ایسی کیا مصیبت آگئی ہے؟" میں تو آہی رہی تھی۔ لیکن نہیں! جب تم گھر آجاتے ہو تو سارے پڑوسیوں کو معلوم ہو جانا چاہیے کہ تم آگئے ہو"۔ اس کی ممی

خفا ہوتے ہوئے بڑبڑائیں۔

لمحہ بھر کے لیے تو امبر نے سوچا کہ وہ اس کا جواب دے لیکن پھر اس نے اپنے کمرے میں پہنچ کر دروازہ بند کرلیا۔ "ارے امبر بیٹا۔ تمہارے لنچ کے بارے میں کیا خیال ہے؟" ممی چلائیں۔

"مجھے بھوک نہیں ہے ممی اور مہربانی کر کے جب تک ڈیڈی واپس نہ آ جائیں مجھے پریشان نہ کیجیے"۔

"کیا تم ٹیلنٹ سرچ مقابلہ" کے لیے وائلن کی مشق کر رہے ہو۔ لیکن تمہاری پڑھائی کا کیا ہوگا؟ تمہارے بارہویں کلاس کے بورڈ کے امتحانات قریب ہیں اور پھر داخلے کے ٹیسٹ بھی تو ہیں"۔

"ارے ممی میں ان کے لیے پڑھ تو رہا ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں ممی کہ بورڈ کے امتحانات میں شاندار رہوں گا۔ جہاں تک آئی آئی ٹی کے داخلہ کے ٹیسٹ کا تعلق ہے آپ جانتی ہیں کہ مجھے انجینئر بننے سے کوئی دلچسپی نہیں"۔

"یقیناً پنڈت روی شنکر ایک موسیقار بننا چاہیں گے۔ تم ایک بگڑا ہوا معاملہ ہو امبر۔ میں تم سے بحث کرنا نہیں چاہتی۔ تمہارے ڈیڈی ہی تم سے اس سلسلے میں بات کریں گے۔ میں باپ بیٹے کے درمیان امن قائم کرانے کی کوششوں سے عاجز آچکی ہوں"۔ اس کی ممی یہ کہتے ہوئے امبر کے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

امبر نے دروازہ بند کر کے غلاف میں سے وائلن نکالی۔ اس نے گز اٹھایا اور اسے بڑے پیار ہی سے نہیں بلکہ احترام سے تاروں سے چھوایا۔ اپنی ممی کے ساتھ اس کی خفیف سی نوک جھونک سے وہ پریشان نہیں ہوا تھا۔ دراصل وہ ان دلیلوں کا عادی ہو گیا تھا۔ امبر اپنے والدین کا اکلوتا بچہ تھا اور انہیں اس سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ وہ پڑھائی میں بہت تیز تھا اس لیے اس کے والد چاہتے تھے کہ وہ ان ہی کی طرح انجینئر بن جائے۔ انہیں یقین تھا کہ اگر امبر نے محنت اور پڑھائی پر توجہ دی تو وہ داخلے کے امتحان میں کامیاب ہو جائے گا۔

امبر انجینئر بننا نہیں چاہتا تھا۔ اسے موسیقی پسند تھی اور وہ اسے خدا کا عطیہ سمجھتا تھا۔ اب موسیقی کے میدان میں اسے اپنی کامیابی کا یقین تھا۔ اس کے میوزک اسکول کے ٹیچر کو بھی یقین تھا کہ وہ مقابلہ میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔

وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ "ہر روز تم جیسا ٹیلنٹ نہیں ملتا۔ تمہیں موسیقی کو کبھی چھوڑنا نہیں چاہیے"۔

اور امبر بھی یہی چاہتا تھا۔ اگر ممکن ہوا تو وہ اسے پیشہ کی طرح اپنانا چاہتا تھا۔

قسمت سے ایک بڑی میوزک کمپنی ایک ٹیلنٹ کی تلاش میں دلچسپی رکھتی تھی اس کے لیے اس نے ایک مقابلہ کا اہتمام کیا تھا۔ پہلا انعام ایک اسکالر شپ پر مشتمل تھا جو دنیا کی مشہور میوزک اکادمی میں غیر ملک میں موسیقی کی پڑھائی کے لیے دیا جانا تھا۔ امبر اسی اسکالر شپ کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مقابلہ کے لیے مشق کر رہا تھا سارا کمرہ دھنوں سے گونجنے لگا۔

اچانک دروازے پر کھٹ کھٹ کی آواز سن کر امبر اچھل پڑا۔ "ارے ڈیڈی آگئے ہیں" کہتے ہوئے اس نے وائلن رکھ کر جلدی سے دروازہ کھولا۔

اس کے ڈیڈی مسٹر کھنہ اندر داخل ہوئے "تو تم اس طرح اپنے امتحان کی تیاری کر رہے ہو" انھوں نے ناراضگی سے کہا۔

"ڈیڈی میں اسکول میں تھا اور چار بجے ہی واپس ہوا ہوں......"۔

"اور تب سے تم وائلن بجا رہے ہو" اس کے ڈیڈی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم کب اپنے داخلہ کے ٹیسٹ کے لیے پڑھائی کرو گے؟ اور تم آج اپنی کوچنگ کلاسوں کے لیے کیوں نہیں گئے؟"

"ارے ڈیڈی۔ میں صرف اس مقابلہ تک کے لیے تھوڑی سی بے قاعدگی برتوں گا اور وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے ختم ہوتے ہی محنت سے پڑھائی کروں گا۔ ڈیڈی مجھے کچھ دن کی مہلت اور دے دیجیے"۔ امبر نے لجاجت سے کہا۔

"تب تک تم موقعہ گنوا چکے ہو گے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ دوسرے لوگ کتنی محنت سے پڑھائی کر رہے ہیں۔ مسٹر لال کا بیٹا ٹیوشن پڑھ رہا ہے اور کوچنگ اسکول بھی جا رہا ہے۔ مسٹر لال کہہ رہے تھے کہ ان کا بیٹا اتنی سخت محنت کر رہا ہے کہ بعض اوقات تو خود انھیں اسے منع کرنا پڑتا ہے۔ کتنا خوش نصیب شخص ہے وہ کہ جسے اتنا لائق بیٹا ملا ہے۔ لیکن نہیں۔ یہ میرا ہی قصور ہے کہ میں نے تمہیں میوزک سیکھنے کا تمہاری ممی کا مشورہ قبول کر لیا۔ اگر تم اسے سیکھنے کے لیے نہیں جاتے تو موسیقی کا یہ کیڑا تمہیں کبھی نہ کاٹتا۔ میں تمہیں تنبیہ کرتا ہوں کہ اگر تم نے اپنے طور طریقے نہیں بدلے اور پڑھائی پر پوری توجہ نہ دی تو مجھے تمہارے موسیقی سیکھنے پر پابندی عائد کرنی پڑے گی۔ اور...... میں تمہارے وائلن کو تالے میں بند کر دوں گا"۔ اس کے بعد ڈیڈی خفا ہوتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے۔

امبر نے دروازہ بند کر لیا اور پڑھائی کے لیے میز پر جا بیٹھا۔ اس نے ایک کتاب اٹھائی اور غصّے میں اسے میز پر پٹخ دیا۔ اس نے اسے دوبارہ اٹھایا اور کھولا لیکن وہ ایک لفظ بھی نہیں پڑھ سکا۔ وہ اس قدر غصّے میں تھا کہ اس پر زیادہ توجہ نہیں دے سکا۔ "آخر میں کیوں، کس لیے کیوں کر انجینئر بنوں؟ میں موسیقار کیوں نہیں بن سکتا۔ اگر وہ اسے پیشہ کی طرح اپنانے دینا نہیں چاہتے تو کم از کم مشغلہ کے طور پر تو اسے جاری رکھنے کی اجازت دے سکتے ہیں۔ آخر ڈیڈی موسیقی سے اس قدر نفرت کیوں کرتے ہیں؟"

وقت گزرتا رہا۔ مقابلہ کی تاریخ قریب سے قریب تر ہوتی گئی۔ اسی طرح امتحانات بھی نزدیک آتے گئے۔ امبر اپنی پڑھائی اور موسیقی کے مقابلہ کے درمیان توازن قائم رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ ہر روز اس کے گھر کا ماحول تناؤ سے پُر ہوتا گیا۔ امبر نے اپنی مشق جاری رکھی لیکن یہ کوشش بھی کی کہ اس کی پڑھائی اور خاص طور سے داخلہ کے ٹیسٹ میں کوئی حرج نہ ہو۔ تاہم جب کبھی اس نے ٹیسٹ کے لیے کتاب کھولی اس کا دل اس میں کبھی نہیں لگا۔

دن بیتتے گئے۔ بورڈ کے امتحانات شروع ہو گئے۔ امبر کے پرچے اچھے رہے اور اسے اچھے نمبروں کو توقع رہی۔ اب موسیقی کا مقابلہ اور داخلے کے ٹیسٹ باقی رہے۔

گھر پر معاملات بدترین ہوتے گئے۔ اس کے ڈیڈی نے داخلہ کے ٹیسٹ کے لیے محنت کرنے کے لیے اس پر بڑا دباؤ ڈالا۔ وہ جانتے تھے کہ امبر کو واقعی انجینئرنگ سے دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ سوچتے تھے کہ ایک بار وہ ٹیسٹ میں کامیاب ہو کر کالج چلا گیا تو وہ پھر اسے پسند کرنے لگے گا۔ تب موسیقی اس کا مشغلہ بن کر رہ جائے گی۔ اگرچہ امبر محنت سے پڑھائی کر رہا تھا لیکن خوش اسی وقت ہوتا تھا جب وہ وائلن بجاتا تھا۔

آخر کار مقابلہ کا دن آ پہنچا۔ مقابلہ سے کچھ روز پہلے امبر نے پورے وقت وائلن بجانے کی کوشش کی تھی۔ اس سبب سے اس کے ڈیڈی بہت ناراض ہوئے۔ اس روز صبح مسٹر کھنہ امبر سے بات کیے بغیر دفتر چلے گئے۔ امبر نے تناؤ کے ماحول میں دن بھر مشق کی۔ چار بجے کے قریب وہ سری فورٹ آڈیٹوریم جانے کے لیے تیار ہو گیا جہاں مقابلہ ہونے والا تھا۔ وہ اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ اس کی ممی ڈرائنگ روم میں بیٹھی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھیں۔ امبر نے ان کے پاؤں چھوئے اور کہا "ممی میں جا رہا ہوں"۔

اس کی ممی نے دعا دیتے ہوئے۔ اس سے کہا۔ "ایشور تمہیں کامیاب کرے"۔

امبر نے کچھ دیر انتظار کیا۔ اسے امید تھی کہ کم از کم اس کی ممی اس کے ساتھ ضرور جائیں گی۔ جب ان کی طرف سے کوئی حرکت نہیں ہوئی تو اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "اگر تم آسکتی ہو تو تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی آ ضرور جانا۔ میرا خیال ہے کہ ڈیڈی سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ آئیں گے۔ بہر حال اگر تم آ گئیں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی"۔ اس نے دروازہ کھولا اور پیچھے دیکھے بغیر باہر نکل گیا"۔
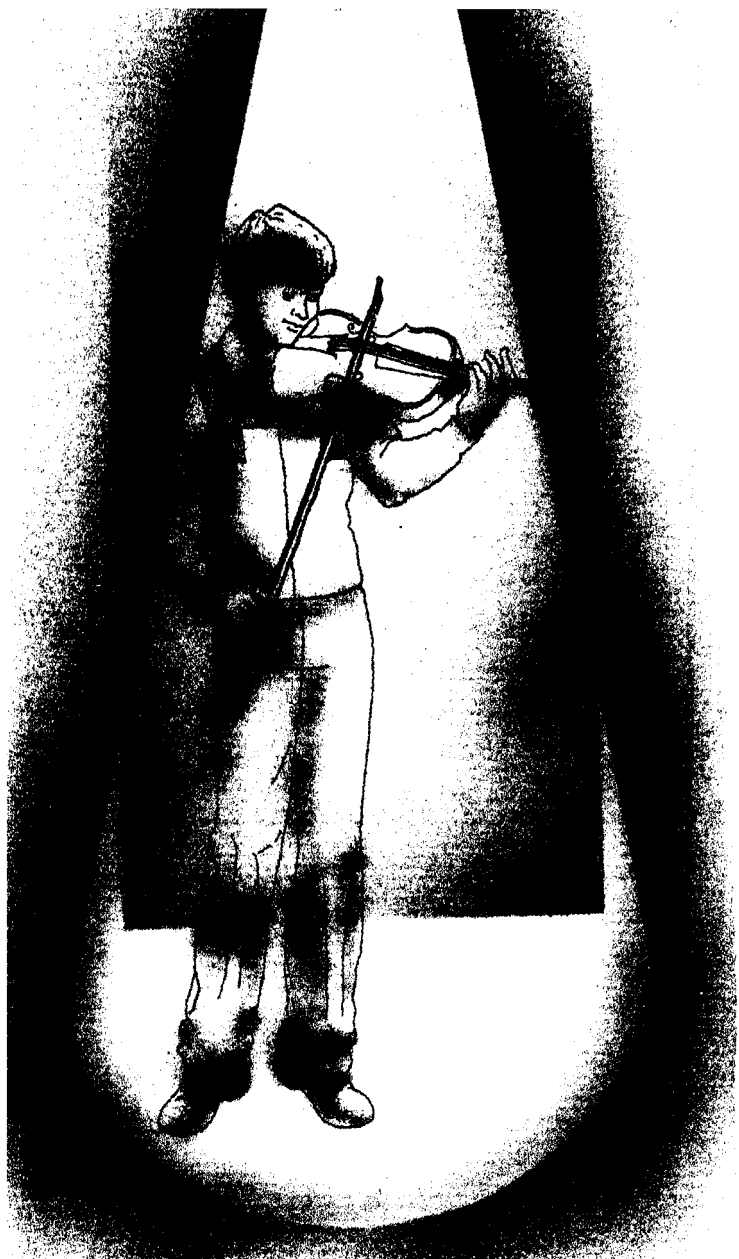
ساڑھے چار بجے وہ سری فورٹ آڈیٹوریم پہنچ گیا۔ ہال میں بڑی گہما گہمی تھی۔ مقابلہ میں شریک ہونے والے امیدوار آچکے تھے۔ وہاں سبھی اپنے والدین یا متعلقین کے ساتھ آئے تھے۔ امبر نے اپنے شکم کے اندر کے خلا کو نظر انداز کیا اور سیدھا اپنے میوزک ٹیچر کے پاس جا پہنچا تاکہ ان سے آخری ہدایات حاصل کر سکے۔

ٹھیک چھے بجے مقابلہ شروع ہو گیا۔ شُرکا ایک کے بعد ایک اسٹیج پر جانے لگے۔ امبر کا نمبر آخر میں آیا۔ کیوں کہ اس نے اپنی درخواست آخری وقت میں بھیجی تھی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ وہ اسٹیج پر جا پہنچا۔ آڈیٹوریم لوگوں سے پُر تھا۔ امبر نے حاضرین پر ایک نظر ڈالی۔ اسے ہلکی سی امید تھی کہ شاید اس کے والدین بھی آتے ہوں لیکن اتنے بڑے ہجوم میں انھیں تلاش کر لینا ناممکن تھا۔ اس نے وائلن اٹھائی، دل ہی دل میں دعا کی اور اس کے تاروں کو چھیڑا۔ جلد ہی وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو گیا اور بجاتا رہا۔

ہال کا شور خاموش ہو گیا اور ہال امبر کے وائلن کی دھن سے گونجنے لگا۔ جب امبر نے بجانا ختم کیا تو ہال میں مکمل خاموشی تھی۔ جب وہ اپنی مدہوشی سے باہر نکلا تو ہال مجمع کی تالیوں سے گونجنے لگا۔ امبر نے سر جھکا کر حاضرین کو تسلیم کیا اور اسٹیج سے نیچے اتر آیا۔ جج نتائج کا فیصلہ کرنے کے لیے باہر چلے گئے اور امبر خاموش بیٹھا رہا۔

جیوری کا چیئرمین نتائج کا اعلان کرنے کے لیے اپنی نشست سے اٹھا۔ ”ہمارا فیصلہ واقعی بالکل سیدھا سادہ ہے“۔ اس نے کہا۔ ”ہم نے متفقہ طور سے فیصلہ کیا ہے کہ پہلا انعام اور اسکالرشپ امبر کھنہ کو دیا جائے“۔

امبر کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے اپنے جسم کو یہ جاننے کے لیے نوچ لیا کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ اس کے میوزک ٹیچر نے اسے گلے سے لگا لیا اور کہا ”شاباش بیٹے شاباش۔ مجھے یقین تھا کہ انعام تم ہی جیتو گے۔ آج تم نے میرا سر فخر سے اونچا کر دیا۔ امبر کو لوگوں نے مبارک باد دینے کے لیے گھیر لیا۔

تاہم ان تعریفوں کے بیچ امبر اپنے والدین کو کھوج رہا تھا۔ کچھ دیر بعد لوگ چلے گئے تو امبر اپنے خیالوں میں کھو گیا۔ تبھی وہ یہ سن کر چونک پڑا کہ "پیارے بیٹے ہمیں تم پر فخر ہے"۔

امبر نے فوراً مڑ کر دیکھا تو وہاں اپنی ممی کو کھڑا پایا اور ان کی پشت پر اس کے ڈیڈی کھڑے تھے۔

"بیٹا مبارک ہو" اس کے ڈیڈی نے کہا۔ ان کا چہرا پہلے کی طرح سنجیدہ تھا۔ لیکن امبر نے ان کے ہونٹوں کے گوشہ پر ایک مسکراہٹ دیکھ لی تھی۔

وہ سبھی ہال سے باہر نکل گئے۔ اور روانہ ہونے ہی والے تھے کہ جیوری کا چیئر مین پہنچ گیا۔ "بیٹا ذرا ایک منٹ ٹھہرو"۔ اس نے امبر سے کہا۔ "تمہاری عمدہ کارکردگی پر مبارک باد۔ تم نے اپنی عمر سے بھی زیادہ بلوغت کے ساتھ اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ تم بڑی صلاحیت کے مالک ہو مجھے یقین ہے کہ تم بہت ترقی کروگے۔ ہر روز کوئی اس طرح کی صلاحیت سے نہیں گزرتا۔ مجھے خوشی ہے کہ میں ایسے باصلاحیت موسیقار کی مدد کرنے کے سلسلہ میں معاونت کر رہا ہوں۔ اس نے ایک بار پھر امبر کی پیٹھ تھپتھپائی اور وہاں سے چل دیا۔

واپسی پر خاموشی رہی۔ امبر کو ندامت کا احساس تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے اپنے ڈیڈی کی سبکی کی ہے۔ اس نے اپنے ڈیڈی کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "ڈیڈی میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں داخلہ کے ٹیسٹ کے لیے جی جان سے محنت کروں گا۔ اگر ضرورت ہوئی تو روزانہ بیس گھنٹے پڑھائی کروں گا لیکن کامیاب ہو کر دکھاؤں گا۔ میں یہ اسکالر شپ قبول نہیں کروں گا۔ میں تو اپنے آپ پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ میں اس میں کامیابی حاصل کر سکتا ہوں۔ میں آپ کی مرضی کے مطابق انجینئرنگ کالج بھی جاؤں گا"۔

امبر کے ڈیڈی نے کچھ جواب نہیں دیا۔ امبر کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کے ڈیڈی اس کے اندازہ سے بھی زیادہ ہی پریشان تھے۔ انھوں نے کار کی رفتار دھیمی کر دی اور پھر اسے سڑک کے کنارے روک کر امبر کی جانب متوجہ ہوئے۔

امبر نے دیکھا کہ اس کے ڈیڈی کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ تاہم ان کا چہرہ ایک روشن مسکراہٹ سے چمک رہا تھا۔ "بیٹا میں بھی تمہاری کامیابی کے اس لمحہ میں تمہیں ایک تحفہ دینا چاہتا ہوں۔ تم اپنا پیشہ خود منتخب کر سکتے ہو۔ تم وہی پیشہ اختیار کرو جو تمہارا دل کہتا ہے۔ انجینئر تو ہزاروں مل جائیں گے لیکن تمہاری صلاحیت کے موسیقار مٹھی بھر ہوں گے۔ میں تمہارا باپ ہونے میں فخر کا احساس کر رہا ہوں"۔ مسٹر کھنہ شفقت سے امبر کا سر سہلانے لگے اور مسز کھنہ اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگیں۔

امبر کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اس نے ہمیشہ اسی انعام کی تمنا کی تھی۔ اُس انعام یا اسکالر شپ کی نہیں کہ اس کے والدین اس پر فخر کا احساس کریں۔

بڑا ہونا

ہیما شنکر نارائن
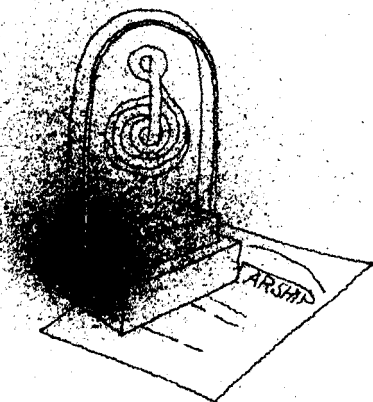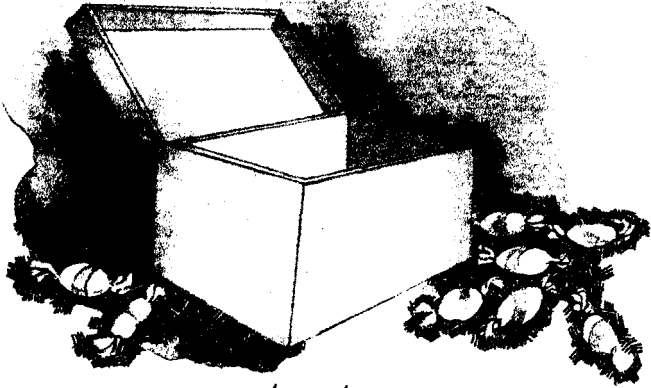
وہ دن سبّو کے لیے بری طرح شروع ہوا تھا۔ پہلے تو وہ اسکول دیر سے پہنچا۔ اس کی بس نکل گئی تھی اس لیے اسے آٹو سے جانا پڑا۔ لیکن وہ پانچویں۔بی کلاس کے اپنے دوست سے ہوم ورک بھی نہیں معلوم کر سکا۔ اگرچہ مس ڈومی نک بہت اچھی ٹیچر تھیں لیکن وہ بڑی سخت تھیں۔ "تم اسکول کے بعد بھی ٹھہرو گے اور 'میری زندگی کا یادگار واقعہ' پر مضمون لکھو گے"۔

اس طرح وہ اپنے دوسرے تین ہم جماعتوں کے ساتھ مضمون لکھ رہا تھا۔ سبّو نے سوچا یہ ایک گھنٹہ جانے کب ختم ہوگا۔ مضمون کے لیے انھیں اتنا ہی وقت دیا گیا تھا۔ کیا تب تک اپّا گھر پہنچ چکے ہوں گے۔ اسے اس کی امید نہیں تھی۔ کیوں کہ اس طرح اس سے اور بھی جواب طلب کیے جا سکتے تھے اور اسے برا بھلا کہا جا سکتا

تھا۔ کیا کام ختم ہونے تک اندھیرا نہ ہو جائے گا؟ اس صورت میں اسے مین روڈ سے ہو کر گزرنا پڑے گا۔ اندھیرے میں کسی لڑکے کی ہمت نہیں تھی کہ وہ مندر والے چھوٹے راستے سے گزرتا۔ اس بارے میں بہت سی بھوتوں اور روحوں کی باتیں مشہور تھیں۔ ہو سکتا تھا کہ وہ سڑک کے اس حصے کو تیز دوڑ کر پار کر لیتے۔ اس لیے یہی بہتر تھا کہ وہ لکھنا شروع کر دے۔ وقت تیزی سے گزر جائے گا۔ وہ سوچنے لگا کہ بارہ سالہ زندگی میں کون سا واقعہ یادگار ہو سکتا ہے۔ کاش وہ زیادہ عمر کا ہوتا تاکہ وہ گاندھی جی یا نیلسن کی کہانی کی طرح اپنی زندگی کے اہم واقعات لکھ سکتا۔ تین ٹانگوں والا بندر یا ہندوستان کے تہوار پر مضمون لکھنا آسان ہوتا۔ کاش ڈومی نک معمول کے مطابق اسے سو بار ''میں نہیں......'' لکھنے کے لیے کہتیں۔ خواہ اسے بائیں سے دائیں یا اوپر سے نیچے لکھنا ہوتا تب بھی تیزی ہی سے لکھا جاتا۔ لیکن ''یادگار واقعات''؟

کیا اسے اس واقعہ کے بارے میں لکھنا چاہیے جب اس نے دوات کو کنجو کی کتابوں پر الٹ دیا تھا۔ جنرل نالج کی کتاب اور سائنس ورک بک پر کچھ دھبّوں کے سبب کنجو نے کتنا شور مچایا تھا۔ وہ کس قدر چیخی چلائی تھی اور لپا نے اسے سزا دی تھی۔ خیر مار کی تو اسے پروا نہ تھی لیکن جس چیز نے اسے پریشان کر دیا تھا وہ یہ تھی کہ کنجو لطف لے لے کر ہر شخص سے اسے بیان کرتی۔ اگرچہ اس کی بڑی بہن مینا نے اس کی دونوں کتابوں کو درست کر دیا تھا تاہم کنجو کے المیہ کا بار بار دہرایا جانا اور اس کی شرارت نے ان کی زندگانیوں میں اہمیت اختیار کر لی تھی۔ سیاہی میں اس کے ہاتھ اس قدر لت پت ہو گئے تھے کہ وہ دھونے کے باوجود ایک دو روز میں بھی صاف نہیں ہوئے۔

اسے ایک واقعہ اور یاد آیا جب اس کے ہاتھ سیاہی میں سن گئے تھے۔ یہ بہت دن پہلے کی بات تھی جب وہ تین یا چار سال کی عمر کا تھا۔ اسے نہیں معلوم کہ اسے از

خود یاد تھا یا اس کی ممی نے اسے بار بار دہرا کر یاد دلایا تھا۔ عام طور سے اس کی ممی اونچے چبوترہ پر کھانا بناتی تھیں لیکن اس دن گیس ختم ہو جانے کی وجہ سے وہ فرش پر بیٹھ کر اسٹو پر کھانا بنا رہی تھیں۔ ستّو نے اپنا ہاتھ ابلتی ہوئی دال میں ڈال دیا تھا۔ مینا نے بتایا کہ وہ بہت دیر چیختا رہا تھا۔ اس لیے اس کے ہاتھ سیاہی میں ڈبو دیے گئے تھے اور مینا اسے گلی میں لے جا کر آتی جاتی گاڑیوں سے بہلاتی رہی تھی۔

مینا بڑی مہربان اور ہمدرد بہن تھی خاص طور سے تکلیف اور پریشانی کے وقتوں میں بعض اوقات وہ اسے خطا کا احساس کراتی تھی خاص طور سے اس وقت جب وہ ممی کو ناراض کر دیا کرتا تھا۔ جب کبھی وہ اور کنجو کوئی غلطی کرتے تو مینا اور ممی ایک طرح سے متحد ہو جاتے تھے۔ البتہ راجو کوئی غلطی نہیں کرتا تھا وہ ہمیشہ 'بے بی' ہی بنا رہتا تھا حالاں کہ وہ ستّو سے صرف چار سال چھوٹا تھا۔ جب کبھی مینا اور ممی اس کی طرفداری کرتیں تو وہ سوچا کرتا کہ کہیں وہ کنجو سوتیلے بچے تو نہیں ہیں۔ لیکن یہ بے معنی سی بات تھی۔ سوتیلے بچے اصل بچوں سے بڑے ہوتے ہیں۔ بہر صورت وہ ممی سے بہت پیار کرتا تھا۔ اس نے صرف ایک بار ہی جان بوجھ کر انہیں پریشان کیا تھا۔

اپا کے کچھ دوست آئے ہوئے تھے ان میں سے ایک نے کافی کا آدھا گلاس چھوڑ دیا تھا۔ ستّو نے اس میں پانی ملا دیا اور ممی سے جا کر کہا۔ "دیکھیے اپا کے دوست نے کافی نہیں پی کیوں کہ اس میں پانی ملایا گیا تھا"۔ اسے کیا پتہ تھا کہ اپا اس کی آواز سن لیں گے اور ممی کے ساتھ لڑ پڑیں گے۔

"تم نے مجھ سے کیوں نہیں کہا کہ دودھ ختم ہو گیا ہے؟ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں میرے دوستوں کا گھر پر آنا پسند نہیں لیکن کیا ان کے ساتھ یہ سلوک کرنا درست ہے؟" بیچاری اماں کو تو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ کیا ہوا ہے۔ ستّو کو اماں

کے ساتھ پاپا کا سلوک بہت برا لگا۔ بعد میں اس نے اپنی اس شرارت سے اماں کو آگاہ کر دیا لیکن انھوں نے کچھ نہیں کہا۔ عام طور سے وہ جلد ہی چیزیں بھول جاتی ہیں لیکن مینا بار بار دہرا کر اسے الزام دیتی رہی کہ میں والدین کے درمیان نفاق پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ دراصل اسے اپنے والدین کی لڑائی بالکل پسند نہیں تھی۔ وہ تو صرف اماں کو پریشان کرنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ انھوں نے دن میں اس کی شکایتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

پاپا اور ان کے دوست سامنے والے کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہ ان سبھی سے واقف تھا۔ گپتا انکل، ونود بھائی، پشاوری۔ وہ اس سے اسکول کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے اور گپتا انکل نے تو بعض اوقات اسے اپنے اسکوٹر پر سواری بھی کرائی تھی۔ جب وہ باتوں میں مصروف تھے تو ستو کھیل رہا تھا۔ جیسے ہی پاپا کسی کام سے اندر گئے ویسے ہی ستو کے ذہن میں ایک خیال در آیا۔ جب پاپا باہر آئے تو جس کرسی پر وہ بیٹھنے والے تھے ستو نے اسے پیچھے کھینچ لیا۔ پاپا نیچے گر پڑے اور سبھی لوگ ہنس پڑے۔ پاپا بھی ہنس دیے اور ستو نے محسوس کیا جیسے ہر شخص نے اسے ہوشیار سمجھا ہو۔ اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ مہمانوں کے چلے جانے کے بعد پاپا اس پر برس پڑیں گے۔

کوئی بھی شخص بڑوں کے طریقوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ وہ اتنے بے اصول ہو جاتے ہیں کہ جن چیزوں کو انھیں یاد رکھنا چاہیے بھول جاتے ہیں۔ اور جن چیزوں کو انھیں بھول جانا چاہیے وہ انھیں بڑی اچھی طرح یاد رہتی ہیں۔ وہ اماں کو بھی اس کے بارے میں بتانے کے لیے گیا تھا۔ کچھ معاملات میں وہ پاپا اور ان کے دوستوں کی طرح بالغ نظر نہیں آتی تھیں۔ اس دن وہ اس کی کوئی بات سننے کے موڈ میں نہیں تھیں اس لیے اس نے کافی کے گلاس میں پانی بھر کر انھیں سنایا تھا۔

ان سبھی واقعات کو یاد کر کے ستّو اداس ہو گا۔ اس لیے اس نے یہ تمنا کی کہ کاش وہ اور اس کے دوست بڑوں کی طرح کبھی بڑے نہ بنیں اور سنجیدہ رہیں۔ دوسری طرف بڑے ہو کر آزاد رہے، اپنی پسندیدہ چیزیں خریدنے، اپنی مرضی کے مطابق آنے جانے اور اپنے استادوں سے سزایاب نہ ہونے کے خیال نے اسے جلد ہی بڑا ہونے کا خواہش مند کر دیا۔

جب ستّو ان خیالوں میں گم تھا کہ چپراسی آگیا۔ مس ڈومی تک جا چکی تھیں وہ کلاس روم کو تالا لگانے کے لیے آیا تھا۔ مس ڈومی تک نے چپراسی سے کہا تھا کہ لڑکوں کو گھر جانے دے۔ انھیں مضمون گھر پر لکھ کر دوسرے دن اسکول لانا تھا۔ لڑکوں نے اپنے بیگ سنبھالے اور جلدی سے باہر دوڑ گئے۔ ستّو کو خوشی تھی کہ گھر پر مینایا کنجو اس کا مضمون پورا کرا دیں گی۔

خوش قسمتی سے ان کے گھر پہنچنے تک اندھیرا نہیں ہوا تھا۔ ستّو لپا کے آنے سے پہلے ہی گھر پہنچ گیا تھا اور کسی نے نہیں دیکھا تھا کہ وہ خلاف معمول دیر سے آیا ہے۔ حالاں کہ کنجو اور وہ ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے لیکن وہ دونوں اپنے اپنے دوستوں کے ساتھ آتے جاتے تھے۔ اسکول میں انھیں بھائی بہن کہلائے جانے کی پروا بھی نہیں تھی۔ بعض اوقات وہ سوچتا تھا کہ کنجو اس سے شرمندہ رہتی ہے تاہم ایک بات تھی جس کے ذریعہ وہ کنجو کو بلیک میل کر سکتا تھا اور وہ یہ کہ جب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ہوتی تو اسے چلّا کر 'کنجو' کہتا۔ کیوں کہ اسکول میں وہ انسویا، کہلاتی تھی اور اس نے اپنے کنجو کے نام کو چھپائے رکھا تھا۔

جب وہ گھر پہنچا تو جنم اشٹمی کی مٹھائی ختم ہو چکی تھی۔ اس نے پروا نہیں کی کیوں کہ اماں نے اسے دودھ کے ساتھ کریم کے بسکٹ بھی دے دیے تھے۔ بہر حال اسے اطمینان تھا کہ وہ لپا کے آنے سے پہلے ہی گھر پہنچ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد پاپا آپہنچے۔ انھوں نے فوراً ہی کپڑے نہیں بدلے۔ بلکہ کافی پینے کے بعد اعلان کیا کہ وہ کچھ نئی کتابیں خریدنے کے لیے "مستو کتاب گھر" جائیں گے۔

"کیا میں بھی چلوں؟" ستو نے پوچھا اور پاپا نے فوراً کہا کہ ہاں۔ جب کبھی وہ عجلت میں نہیں ہوتے تھے تو اپنے ساتھ گنجو یا ستو کو بازار ضرور لے جاتے تھے۔ ایسے مواقع پر انہیں آئس کریم بھی کھانے کو مل جاتی تھی۔

ستو کو بک شاپ پر جانا پسند تھا۔ یہ ایک بڑی سی دوکان تھی جس کی تین دیواروں پر کتابیں جمی ہوئی تھیں۔ اس میں اخباروں کی خوشبو مہکتی رہتی تھی۔ دوکان کے سامنے ہی میگزین اور کامکس رکھے تھے اور کاؤنٹر کے نیچے کاروں، کارٹون کے کرداروں وغیرہ کے اسٹکر تھے۔ ستو کو اسٹکر پسند تھے۔ کبھی کبھی پاپا اس کے لیے کامک یا اسٹکر لایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ دوکان دار داس انکل بھی اسے بہت چاہتے تھے۔ ستو ایک مدت سے دوکان پر نہیں گیا تھا۔ لیکن جب کبھی وہ وہاں جاتا تھا تو داس انکل اسے ایک دو چاکلیٹیں دینا نہیں بھولتے تھے۔ ان کی جس دراز میں پیسے رکھے رہتے تھے اسی میں چاکلیٹوں کا باکس رکھا رہتا تھا۔ اسی میں سے وہ ان بچوں کو چاکلیٹ بانٹا کرتے تھے جن کے والدین کتابیں خریدنے کے لیے وہاں آیا کرتے تھے۔

اس روز دوکان میں بہت کم خریدار تھے۔ ان میں ایک خاتون بھی تھی جس کے ساتھ آیا ہوا بچہ دوکان میں اندر باہر دوڑ رہا تھا۔ ستو نے ایک 'فینٹم' اٹھا لیا۔ اس نے سوچا کاش نصابی کتابوں میں کامکس بھی شامل ہوتے۔ اس کی کچھ کتابیں تو اتنی اکتا دینے والی تھیں کہ ان میں ایک بھی تصویر نہیں تھی۔

چھوٹا بچہ دوڑتا ہوا پھر اندر آ گیا۔ داس انکل نے اسے اپنے پاس بلایا۔ جب وہ

نزدیک آیا تو انھوں نے دراز میں سے ایک چاکلیٹ نکال کر دیا۔ سنّو اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ داس انکل نے شاید اسے دیکھا نہ تھا۔ کچھ دیر بعد داس انکل اس کی طرف متوجہ ہوئے اور انھوں نے اس کے لیے بچوں کی کچھ کتابیں باہر نکالیں۔ وہ پہلے ہی کی طرح دوستانہ رخ اختیار کیے ہوئے تھے اس لیے سنّو نے سوچا کہ جب وہ لپّا کے لیے بل بنائیں گے تو شاید اسی وقت اسے چاکلیٹ بھی دیں گے۔ جلد ہی لپّا پانچ چھے کتابیں لے آئے۔ انھوں نے داس انکل سے کچھ دیر بات کی اور بل کی رقم ادا کر دی۔ اس کے بعد بھی چاکلیٹوں کا پتہ نہیں تھا۔ سنّو بہت مایوس ہوا لیکن اپنی خودداری کے سبب اس نے خود نہیں مانگا۔ جب وہ دوکان سے باہر نکل آئے تو اس نے دوسرے لڑکے کی طرف دیکھا۔ وہ کافی چھوٹا تھا سات یا آٹھ برس کا رہا ہوگا۔

سنّو راستہ بھر سوچتا رہا۔ آج کل لپّا اس کا ہاتھ پکڑ کر چلنے کی ضد نہیں کرتے اس لیے آہستہ آہستہ سنّو کو یقین ہو چلا کہ "میں اب بارہ برس کا ہو گیا ہوں اور داس انکل نے بھی مجھے چاکلیٹ نہیں دیے شاید میں اب بڑا ہو گیا ہوں"۔
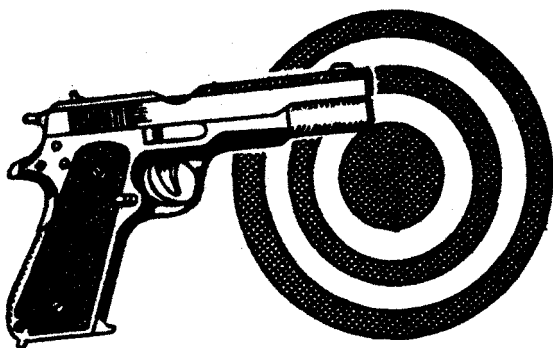
پُل

انیس و عائشہ حمید

چاندی کے خوب صورت فریم میں دو تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ایک تصویر میں ایک چھوٹا بچہ ہاتھ میں غلیل لیے ہوئے ایک کچے آم کو نشانہ بنانے کے لیے اس پر اپنی نظریں مرکوز کیے ہوئے تھا۔ دوسری تصویر ایک دل کش لڑکی کی تھی جس کے ایک ہاتھ میں پستول تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک ٹرافی تھی۔ راجیو کیبنٹ کے پاس کھڑا اپنی بہن سنجنا کے فوٹوگرافس دیکھ رہا تھا اور مایوس ہو رہا تھا۔ یادوں کی وادی میں لوٹ کر اس نے کراہتے ہوئے اپنے ہاتھ کو کیبنٹ پر دے مارا۔ اس کے نتیجے میں فریم چور چور ہو گیا اور چاروں طرف شیشے کے ذرّے بکھر گئے۔

"میرے خدا، یہ سب کیا ہے؟" دروازہ کھلا اور سنجنا کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے بکھرے ہوئے شیشہ پر نظر ڈالی اور راجیو کو دیکھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ رو پڑے گی۔

"اوہ راجیو! کیوں؟"

راجیو ہچکچایا۔ اس نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا "دیدی میں اسے اب اور

برداشت نہیں کر سکتا۔ میں پاپا کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن جبراً کسی چیز میں دھکیل دیے جانے کو دل سے ناپسند کرتا ہوں"۔

سنجنا نے سمجھ جانے والے انداز میں سر ہلایا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم آج نشانہ کی مشق نہیں کروگے؟"

"نہیں"

"تو میں پاپا سے کیا کہوں؟"

"کوئی بھی بہانہ کردینا"

"کوئی دوسرا بہانہ بتاؤ" سنجنا نے اپنے آنسوؤں میں سے مسکرانے کی کوشش کی۔

"تب انہیں سچ سچ بتادو۔ انہیں گزشتہ ناکامی کے بارے میں بھی بتادینا"۔

"میں انھیں بتاچکی ہوں"

راجیو نے تجسّس کے ساتھ اپنے چاروں طرف دیکھا۔ "پھر انھوں نے کیا کہا۔ کیا وہ سمجھ گئے"۔

"نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ایک طرح سے تو وہ سمجھ گئے۔ انھوں نے کہا کہ ناکامیابی بھی ہر کھیل کا حصہ ہوتی ہے۔ اصل بات پریشان نہ ہونے کی ہے۔ انھوں نے یہ بھی......"۔

"میں جانتا ہوں کہ انھوں نے اس کے علاوہ اور کیا کہا ہوگا" راجیو کی آواز حیرت انگیز طریقہ سے خام تھی۔ انھوں نے کہا ہوگا کہ میں نے ایک بچے کی طرح ان ناکامیوں کو حاصل کیا ہوگا۔ ارے دیدی۔ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ مجھے اس میں ذرا بھی دلچسپی نہیں؟ ایسا نہیں ہے کہ میں سیدھا نشانہ نہیں لگا سکتا۔ بس جب بھی میں گھوڑا دبانا چاہتا ہوں کچھ نہ کچھ غلطی ہو ہی جاتی ہے یہاں تک کہ کوچ بھی محسوس کرتا ہے کہ میں اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں۔ لیکن میں پاپا سے کیا کہوں؟

دیدی کیا تم خود حالات کا اندازہ نہیں کر سکتیں؟ تم میری نرم و نازک گڑیا جیسی شکل والی بہن ہو جو بغیر کسی کوشش کے بیل کی آنکھ کو نشانہ بنا سکتی ہو۔ جب کہ میں ہنسی کا موضوع ہی بن کر رہ جاتا ہوں اور نہ کہ مجھے صرف گڑیوں ہی سے کھیلنا چاہیے"۔

"اچھا بند کرو راجیو! کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہارے درد سے واقف نہیں ہوں؟ کیا تم سوچتے ہو کہ جب مجھے مبارک باد دی جاتی تو میں ان مصنوعی تبصروں کو سن کر خوش ہوتی ہوں؟ میں اسے سخت ناپسند کرتی ہوں راجیو۔

کبھی کبھی تو میں سچ مچ یہ سوچتی ہوں کہ مجھے نشانہ بازی ترک کر دینی چاہیے تاکہ ہمارے درمیان مقابلہ کا سوال ہی نہ اٹھے۔ میں جانتی ہوں کہ پاپا یہ دیکھ کر چڑ چڑا جاتے ہیں کہ میں اس چیز میں لطف لیتی ہوں جس سے تم نفرت کرتے ہو"۔

"اگر ایسا ہے تو یہ غلط خیالی ہے۔ ہمارے درمیان کوئی مقابلہ نہیں ہے اور نہ آئندہ کبھی ہوگا۔ تم تو نیشنل چیمپین ہو جب کہ میں ایک ناسمجھ ہوں"۔

"اگر تم نے صبر سے کام لیا تو وہ بھی نہیں رہو گے۔ تمہیں آہستگی سے گھوڑا دبانا چاہئے نہ کہ......"

"بس بس رہنے دو دیدی۔ اب تم پاپا کی طرح باتیں کر رہی ہو"۔ راجیو کا چہرا غصے سے سرخ ہو گیا"۔

"اچھا بھیا سکون سے رہو"۔ سنجنا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اچھا ہو گا اگر تم میرے لیے پاپا سے بہانے بنانے سے پہلے اپنے کلب روانہ ہو جاؤ"۔

راجیو کی مسکراہٹ سورج کی روشنی کی طرح روشن تھی۔

"تو ٹھیک ہے بہن۔ بعد میں ملاقات ہو گی۔ اس نے سنجنا کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور اس دروازہ سے باہر نکل گیا جو سامنے والے گپھاؤں کے پھاٹک کے مقابل تھا"۔

"نوجوان دیکھ کر چلو۔ آخر یہ سرپٹ دوڑ کیوں ہے؟ انکل گپتا نے اپنی گول مول بیوی پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

"کیا ریلے ریس مشق کی جا رہی ہے؟"

"نہیں" راجیو نے جواب دیا۔ "میں تو اسکول بینڈ کے مارچ پاسٹ کی مشق کر رہا ہوں"۔

مسز گپتا نے اسے "کس قدر ذہین ہے" کا خطاب دیا تو وہ بے مزہ ہنسی ہنس دیا۔

سجنا راجیو کے مخفی جذبہ سے واقف تھی۔ یہ تھی موسیقی۔ اگر اسے طبلہ تھپتھپانا یا ستار کے تاروں کو چھیڑنا پسند ہوتا تو اس کے پاپا مسٹر سکسینہ نے صرف آہ بھرلی ہوتی اور اپنے دوستوں سے کہا ہوتا کہ شاید وہ کلاسیکی موسیقی میں دلچسپی رکھتا ہے یا اگر راجیو نے کچھ روح پرور غزلیں ہی گانے کا ارادہ ظاہر کیا ہوتا تب بھی وہ اسے معاف کر دیتے لیکن...... بونگو، ڈھول، راک میوزک......؟ نہیں، کبھی نہیں۔

کیا اس طرح وہ اپنی زندگی گزار لے گا؟"مسٹر سکسینہ گرجے"۔ لیکن میری زندگی میں نہیں۔

"اگر صرف پاپا ہی نرم پڑ جائیں" سجنا نے مایوسانہ انداز میں کہا۔ "اگر صرف پاپا ہی یہ احساس کرلیں کہ ہر شخص الگ الگ بنایا گیا ہے اور اپنے والدین کا کلون نہیں ہوتا تو زندگی آسان ہو جائے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ مغربی موسیقی سے نفرت کرتے ہیں لیکن اپنے ہی بیٹے کو صرف اس لیے ذلیل کرتے ہیں کہ وہ اسے پسند کرتا ہے۔ حد ہوگئی۔ اگر پاپا حقیقت سمجھ سکتے اور کاش راجیو بھی تھوڑا سا جھک جاتا"۔

حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ کھانا موت کی خاموشی میں کھایا جاتا تھا۔ نہ مسٹر سکسینہ نہ ہی راجیو ایک دوسرے کی موجودگی برداشت کرتے تھے۔ کوئی ایک کمرے میں داخل ہوتا تھا تو دوسرا کمرے سے باہر نکل جاتا تھا۔ دل شکستہ اور دونوں کے درمیان سینڈوچ بنی دونوں ماں بیٹی باپ اور بیٹے کے درمیان بڑھتے

ہوئے فاصلہ سے بے یارو مددگار نظر آتی تھیں۔ راجیو نے پہلے دھمکی دی تھی کہ اگر اسے اور دھکیلا گیا تو وہ گھر چھوڑ کر چلا جائے گا۔ وہ اپنے قول پر عمل نہ کرتا اگر غصہ کے عالم میں مسٹر سکسینہ نے یہ کہہ کہ راجیو کو ذلیل نہ کیا ہوتا کہ وہ آیا بزدل اور کمزور ہے کہ گھر چھوڑ دینے کا مردانہ عمل کر سکے۔ یہ بات سن کر راجیو نے گھر چھوڑ دیا۔

چند گھنٹوں تک جب راجیو گھر نہیں لوٹا تو پاگل پن میں مسٹر سکسینہ اور سنجنا نے اس کے دوستوں کے ساتھ رابطہ قائم کرنا شروع کیا۔

"کیا کسی نے راجیو کو دیکھا ہے؟ کیا کسی نے اس کی آواز سنی ہے؟" آخری سوال کا جواب اثبات میں ملا۔

"جی ہاں آنٹی میں نے ابھی ایک لڑکے کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ راجیو کیزولٹی میں ہے"

"کیا؟ ہے بھگوان! کیا کوئی حادثہ ہو گیا؟"

"نہیں اس طرح کا حادثہ نہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ راجیو نے کسی لڑکے کا قوت آزمائی کا چیلنج قبول کر لیا اور بری طرح شکست کھا گیا۔ میرا خیال ہے کہ اسے ٹانکے لگانے پڑیں گے"۔

"قوت آزمائی؟ ٹانکے؟" سنجنا نے اپنی ماں کے ہاتھ سے رسیور تقریباً چھینتے ہوئے کہا "راجیو تو کبھی باکسر نہیں تھا"۔

"شاید نہیں، لیکن اس نے مقابلہ تو خوب کیا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ اس وقت تک نہیں گرا جب تک......"

سنجنا نے باقی کی تفصیلات نہیں سنیں۔ صدمہ اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کے ڈیڈی دروازے میں کھڑے سن رہے تھے۔ ان کے ہاتھ آگے کی طرف بڑھے ہوئے تھے جیسے وہ مدد طلب کر رہے ہوں۔

"ایکسیڈنٹ؟ راجیو؟"

☆☆☆

نشہ اور دوا کے زیر اثر زخمی راجیو پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ مسٹر سکسینہ خاموشی سے اپنے بیٹے کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ راجیو کی حالت قابل دید تھی۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ ایک آنکھ بند ہو چکی تھی دوسری آنکھ چوٹ کھا کر باہر نکل پڑ رہی تھی۔ اس کے گال پر خراش سرخ ہو گئی تھی اور پھٹا ہوا ہونٹ ایک لٹکے ہوئے دانت کا نظارہ پیش کر رہا تھا۔

"وہ کون تھا جس نے اس کا یہ حشر کیا؟" مسٹر سکسینہ گرجے۔ درد اور غصہ ان کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔

"آپ نے پاپا آپ نے"

حیرت انگیز طور پر مسٹر سکسینہ خاموش رہے اور تب سے ایک لفظ نہیں بولے سوائے اس کے کہ اپنی بیوی کا ہاتھ تھام کر دھیمی آواز میں کہتے رہے کہ "میں نے تقریباً اسے کھو دیا"

ان کی بیوی نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ سمجھتی تھی۔ وہ راجیو کے زخمی چہرے کی بات نہیں کہہ رہے تھے بلکہ ان کے درمیان ذہنی فاصلہ کی بات کر رہے تھے۔

"ہاں" انھوں نے بھی آہستگی سے کہا۔ "لیکن ہم اسے پھر سے گھر لے آئیں گے"۔

سجنا انھیں پر سکون بیٹھی دیکھتی رہی۔ اسے بہت کچھ کہنا تھا اس کے لیے ہمت کی ضرورت تھی۔ شاید اب اس کا وقت آ پہنچا تھا۔

"پاپا؟"

مسٹر سکسینہ نے صرف اپنا سر ہلا دیا۔

"پاپا جب میں نے کہا تھا کہ آپ ہی راجیو کی اس حالت کے ذمہ دار ہیں تو واقعی یہی میرا مطلب تھا۔

سجنا کے پاپا نے نظر اٹھا کر دیکھا مگر ان کی آنکھوں میں غصہ نہیں تھا۔ شاید ایک معمولی سی حیرت تھی جیسے وہ واقعات کی نوعیت سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

"پاپا۔ میں یہ نہیں کہہ رہی ہوں کہ آپ نے اسے اس خطرناک چیلنج قبول کرنے پر مجبور کیا لیکن اس کا مطلب یہی ہے کہ آپ ہی نے اسے اس چیلنج کو قبول کرنے پر مجبور کیا۔ آپ کے دن رات کے طعنوں نے اسے ہمیشہ کے لیے یہ ثابت کرنے پر مجبور کر دیا کہ وہ ناقص العقل ہے۔ پاپا یہ آپ کے ہی الفاظ تھے۔ اس لیے اس نے پیچھے ہٹے بغیر ایک مرد کی طرح چوٹیں سہہ لیں۔ اگرچہ وہ شکست کھا گیا لیکن پیچھے نہیں ہٹا۔ پاپا وہ بھاگا نہیں۔ کیا آپ نے سنا نہیں کہ لڑکے کیا تفصیلات بیان کر رہے تھے۔ کس طرح ہجوم ہمت افزائی کر رہا تھا۔ انھیں خون کی بو آ رہی تھی اور وہ اس کے لیے چلا رہے تھے۔ اگر کوئی ناقابل نقصان ہو جاتا تو کیا آپ کا غرور مطمئن ہو جاتا۔

"کبھی نہیں" مسٹر سکسینہ کی آواز جذبہ کی شدت سے سخت ہو گئی تھی۔ "کبھی نہیں"۔

مسز سکسینہ نے آنسوؤں کے ذریعہ اپنی بات کہی۔ "مجھے اس کا اعتراف ہے کہ ہم نے اس کی پسند پر کبھی فخر نہیں کیا۔ میرے خیال میں اس سلسلے میں ہم کچھ زیادہ
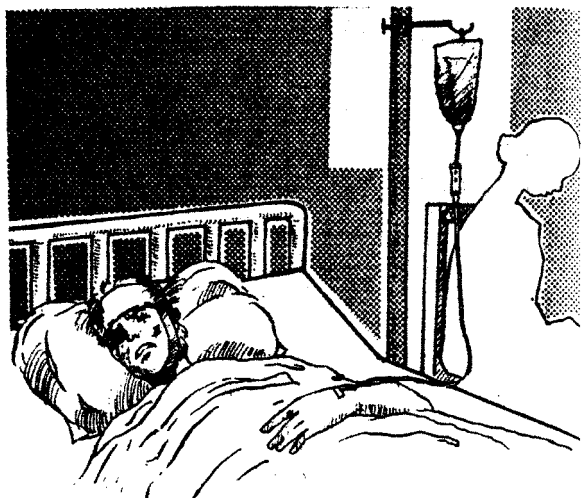
ہی پرانے خیالات کے لوگ ہیں۔ ہمارے لیے یہ وقت اور صلاحیت کو ضائع کرنے کے مترادف تھا لیکن میں نے ہمیشہ اس کے لیے اسے چھُپایا"۔

"ممی" سنجنا اب واقعی ناراض تھی۔ "چھپانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی"۔ راجیو کی پسند خود اس کی اپنی پسند تھی چاہے ہمیں اچھا لگے یا نہیں لگے۔ ہمیں اس کا احترام کرنا سیکھنا ہوگا۔ اس پوری مدت میں تمہارے بیٹے کی قائم مقام رہی۔ میرے لیے تمہاری یہ تعریف کہ یہ تمہاری بیٹی تھی نہ کہ بیٹا جس نے بارودوں، ہتھیاروں کے لیے داداجی کا جذبہ وراثت میں پایا ہے۔ کیا آپ سوچتے ہیں جین (Gene) کا انتخاب بھی ہم نے وراثت میں پایا ہے ؟"

"ہاں اب مجھے احساس ہو رہا ہے" مسٹر سکسینہ نے ٹھنڈی سانس بھرتے بھرتے کہا۔ ضائع کیے جانے والے برسوں کے افسوس کا اظہار ان کی آواز سے ظاہر تھا۔

"راجیو میرے بیٹے۔ میں تمہیں آسانی سے کھو سکتا تھا لیکن اب بھی دیر نہیں ہوئی ہے..... ٹھیک ہے نا؟"
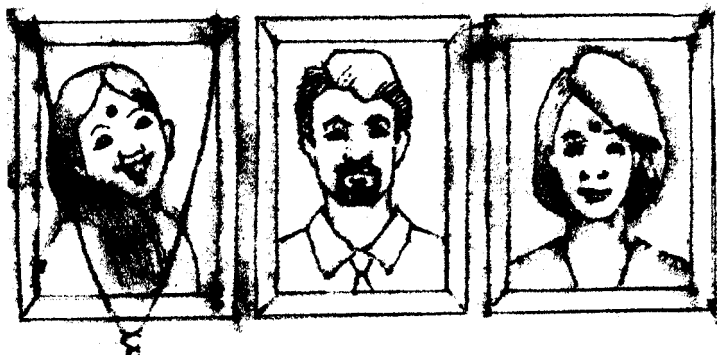
میری دوسری ماں

مادھوی مہادیون

اس صبح جب میں سو کر اٹھا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ ایک بڑا سخت دن ہوگا۔ میرا خیال بالکل صحیح نکلا۔ اس دن میرے پاپا نے دوبارہ شادی کی تھی۔

رجسٹریشن آفس جاتے ہوئے میں نے دھوئیں کے مرغولوں کی طرح دعائیں کیں۔ کاش کوئی انہونی ہو جائے۔ آندھی چل جائے، زلزلہ آجائے، سیلاب آجائے یا کم از کم ٹائر ہی پھٹ جائے۔ لیکن داداجی کی ۱۹۵۲ کی مورس مائنر بھی بڑی وفادار ثابت ہوئی۔ وہ بڑے وقار اور انداز سے سڑک پر لڑھکتی رہی اور ہم وقت پر رجسٹریشن آفس پہنچ گئے۔

چند ہی لمحوں میں جوشی خاندان کے لوگ آپہنچے۔ وہ بہت شور شرابہ کرنے والے لوگ تھے۔ بڑے لوگ بڑی ہل چل کر رہے تھے اور مسکراتے بہت تھے۔ بچے باتونی تھے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہ بہت مطمئن اور خاموش تھی۔

ہم رجسٹرار کے دفتر میں داخل ہو گئے۔ افسر اتنے بہت سے لوگوں کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہ ایک پتلا دبلا، خشک سا بوڑھا آدمی تھا اور چڑچڑا نظر آتا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ تھکا ہوا ہے۔

میرے کچھ جاننے سے پہلے ہی تقریب ہو چکی تھی۔ رجسٹرار کچھ منمنایا۔ جب کسی نے اسے جواب نہیں دیا تو اس نے ذرا اونچی آواز میں کہا" مبارک ہو اب آپ شادی شدہ ہو گئے ہیں"۔

حاضرین نے پریشانی کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ مکل چاچا جلد ہی ہوش میں آ گئے۔ انھوں نے ڈیڈی کو گلے لگالیا۔ سبھی لوگ اس اشارے کے منتظر تھے۔ انھوں نے باتوں کا سلسلہ چھیڑ دیا اور ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔ میرے چھوٹے بھائی سُمیت نے بڑا لطف لیا مگر میں الگ تھلگ اکیلا رہا۔

ہم سورج کی روشنی میں باہر نکل آئے۔ وہاں کوئی شخص ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ وہ شوم ماما تھے۔ مجمع پر خاموشی چھا گئی۔

"مجھے خوشی ہے شوم کہ تم آگئے" ڈیڈی نے اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ شوم ماما نے ہاتھ ملایا اور پھر اس کی طرف مڑ گئے۔ "میں تمہارے لیے ہر خوشی کی تمنا کرتا ہوں۔ وہ مسکرائے۔ "ایشور تمہیں خوش رکھے"۔

سمیت ماما کے پاؤں سے چمٹ گیا۔ "آپ اکیلے کیوں آئے ہیں؟ اس نے پوچھا۔

"ارے سُمیت" مکل چاچا نے مداخلت کی "کیا تم وہ سرخ غبارہ لو گے؟"

"شوم چلو لنچ کرلیں" داداجی نے دعوت دی۔

شکریہ! لیکن مجھے جلدی دفتر واپس ہونا ہے" ماما نے کہا۔ "اچھا مجھے اجازت دیجیے" میرا خیال تھا کہ اس مجمع میں انھوں نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن انھوں نے مجھے دیکھ لیا اور مسکرا دیے۔ میرے شوم ماما دراز قد اور چوڑے ہیں ان کے سر پر بال نہیں ہیں۔ جب وہ مسکراتے ہیں تو بالکل ماں لگتے ہیں۔ انھوں نے میرے بالوں کو سہلایا اور جانے کے لیے مڑ گئے۔ انھیں جاتا دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے دروازہ بند ہو گیا ہو۔

ٹھہریے شوم ماما۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیے۔ مجھے ناناجی اور نانی ماں کے گھر لے چلیے میری ماں کے گھر۔ اس مسحور کن وسیع باغ میں جہاں کبھی وہ کھیلتی

تھیں۔ ان کمروں میں جو ان کا انتظار کرتے نظر آتے ہیں، جس طرح میں انتظار کرتا ہوں۔

لفظ میرے حلق میں پھنس گئے۔ میں نے آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا تو وہ جا چکے تھے۔ "آؤ بیٹا" ایک پرسکون تھکی ہوئی آواز نے کہا "آؤ اب چلیں"۔

میں نے ڈیڈی کا ہاتھ اپنے کندھے پر رکھا پایا میں نے اسے ہٹا کر کار میں جا بیٹھا۔

☆☆☆

"وِدُر میں تمہارے بچوں کی پوری طرح دیکھ بھال کرتے کرتے تھک گئی ہوں"۔ دادی ماں نے کہا تھا "انھیں ایک ماں کی ضرورت ہے"۔ اس دن میں اپنا رپورٹ کارڈ گھر لایا تھا لیکن میں نے اسے دادی ماں کو نہیں دکھایا۔ شام میں میری کلاس ٹیچر نے فون کیا۔ میں نے دادی ماں کو ان سے بات کرتے ہوئے سنا تھا۔ اس لیے اپنی سائیکل نکالی اور بھاگ کھڑا ہوا۔

وقت پر جب میں گھر پہنچا تو میں نے ڈرائنگ روم میں کچھ آوازیں سُنیں۔ ڈیڈی واپس آگئے تھے۔ وہ کامرشیل پائلٹ ہیں صرف ویک اینڈس پر ہی ان سے ہماری ملاقات ہوتی ہے۔ میں نے چھپ کر گزر جانا چاہا لیکن دادی ماں نے مجھے دیکھ لیا۔

"ارجن بیٹا" انھوں نے پکارا۔ "ذرا اپنا رپورٹ کارڈ تو لانا"

بعد میں شب بخیر کہنے کے لیے ڈیڈی آگئے۔ سُمیت سو چکا تھا میں نے سونے کا بہانہ کیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈیڈی وہ سب کچھ جان گئے ہیں۔ وہ بستر کے کنارے بیٹھ کر میری پیشانی سہلانے لگے۔ میں اپنے آنسوؤں کو نہیں روک سکا جب میں چیخ پڑا تو انھوں نے مجھے پکڑ لیا۔

"مجھے افسوس ہے" جب بولنے کے لائق ہوا تو میں نے کہا" ریاضی نے مجھے بہت شرمندہ کیا ہے۔ میں اسے سمجھ نہیں پاتا ہوں۔ میڈم بہت تیز پڑھاتی ہیں۔ میں ٹیوشن پڑھوں گا اور سخت محنت کروں گا"۔

"یہ ریاضی ہی نہیں ہے ارجن" ڈیڈی نے افسردہ لہجہ میں کہا۔ "یہ تم خود بھی ہو۔ تمہارے ٹیچرس فکر مند ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تم کلاس میں بیٹھ کر صرف کھڑکی

سے باہر گھورتے رہتے ہو۔ تم نے تمام سرگرمیوں میں حصہ لینا بند کردیا ہے۔ تم بمشکل باتیں کرتے ہو"۔

بھلا میں کیا کہتا؟ میرے کہنے کے لیے رہ ہی کیا گیا تھا؟

"میرے بچے ہر شخص سمجھتا ہے۔ تمہاری ممی کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ انھیں کوئی واپس نہیں لا سکتا۔ ہمیں آگے بڑھنا سیکھنا چاہیے۔ اس کے علاوہ چارہ ہی نہیں ہے۔ ہم ایک زمانہ میں پورا کنبہ ہوا کرتے تھے"۔ انھوں نے دھیمے لہجہ میں کہا جیسے کہ وہ خود آگے بڑھانا چاہتے ہوں انھوں نے اچانک بڑے اعتماد بھرے لہجہ سے کہا۔ ہم پھر ایک پورا کنبہ بن جائیں گے۔

☆☆☆

کیا اب ہم ایک کنبہ ہیں؟

ہم ایک نئے شہر میں آگئے ہیں۔

جہاں نیا فلیٹ ہے، نئے پردے ہیں اور نئی آوازیں ہیں۔

برسوں سے میں سپر بھاتم کی موسیقی سے جاگتا تھا۔ ماں کو یہ پسند تھا۔ سرد صبح کی تازگی میں سُر ابھرتے اور اونچے ہوتے رہتے تھے۔ میں نے اپنے دانت برش کیے، اسکول کا ڈریس پہنا اور دودھ کا گلاس پیا۔

"ارجن تمہارا لنچ باکس" ماں کچن میں سے پکارتی۔ وہ نیلے ڈریسنگ میں گاؤن میں اپنے لمبے بالوں کے ساتھ ہوتی تھی۔

میں جانتا تھا کہ میرے لنچ باکس میں کیا ہو سکتا تھا۔ وہی چیزیں جنھیں میں پسند کرتا تھا یعنی سبزی کے سینڈوچ، اڈلی اور چٹنی۔ لیکن ہمیشہ ہی ایسا نہیں ہوا۔ دادی ماں مجھے وہی چیزیں دیتی تھیں جو وہ دادا جی کے ناشتہ کے لیے تیار کرتی تھیں۔ جیسے سوجی کا حلوہ، آلو پوری وغیرہ۔ تیل میری کتابوں کو خراب کردیتا تھا۔

اور اب۔ کوئی بہتری نہیں ہوتی۔ ویفر بسکٹ، چھوٹے چھوٹے گول سے سینڈوچ اور ٹافیاں۔ یہ سُمیت کے لیے تو ٹھیک ہے جو صرف پانچ سال کا ہے۔ لیکن میں تیرہ برس کا ہوں۔ میں یہ بچوں کا کھانا کیسے کھا سکتا ہوں؟" تم نہیں جانتیں کہ ماں

کس طرح بنا جاتا ہے"۔ ایک روز سُمیت نے اس سے کہہ دیا۔
اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تو تم سکھا دو"۔
"اپنے بال بڑھاؤ" اس نے کہا۔ جب برسات ہونے لگے تو گرم گرم پکوڑے بناؤ۔
میرے سونے سے پہلے مجھے کہانی سناؤ"۔
"اور کچھ؟"
"دو کہانیاں" اس نے ہوشیاری سے کہا۔ وہ ہنس پڑی۔
اب سُمیت اسے ماں کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ وہ اس کو پسند کرتا ہے۔ آپ بھی اسے دیکھ سکتے ہیں۔
میں اسے کچھ نہیں کہہ کر پکارتا۔
میں مشکل ہی سے اس سے بات کرتا ہوں۔
"ارجن لاؤ میں تمہاری قمیص کی مرمت کر دوں"۔
"نہیں شکریہ، میں خو مرمت کر لوں گا"
"ہوم ورک میں کوئی مدد چاہیے ارجن"
"نہیں تمہارا شکریہ"
ارجن کچھ اور کھیر"
"نہیں شکریہ"

☆☆☆

پچھلے سنیچر کو وہ بولی "میرے پاس دی لاسٹ ورلڈ" کے تین ٹکٹ ہیں۔ ہم اس کے بعد پزا کھائیں گے۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"
سُمیت خوشی سے اچھل پڑا۔ "ہپ ہپ ہُرے"
"کیا تم دونوں پندرہ منٹ میں تیار ہو جاؤ گے؟"
بعد میں اس نے بڑے کمرے میں جھانکا تو میں بستر میں لیٹا ہوا واک مین پر

موسیقی سن رہا تھا۔
"ارجن تم تیار ہو گئے؟"
کیا اندھی تھی۔ میں نے تو برموڈا اور اور ٹی شرٹ تک تبدیل نہیں کیے تھے۔ وہ جواب کے لیے وہیں کھڑی رہی۔
"میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا"
"آخر کیوں؟"
"جی نہیں چاہ رہا ہے"
"میں نے تو تمہیں اپنے پاپا سے کہتے ہوئے سنا تھا کہ تم اس فلم کو دیکھنا چاہتے ہو"
"میں نے اب اپنا ارادہ بدل دیا ہے" میں نے سرد مہری سے جواب دیا۔
اس کا چہرا سرخ ہو گیا۔
فضا میں کش مکش طاری ہو گئی۔ سُمیت نے ہمارے چہروں کی طرف دیکھا۔ وہ گھوم کر میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔
"میں بھی بھیا کے بغیر نہیں جاؤں گا" اس نے کہا۔
اس کی آنکھوں نے میرے چہرے کو گھورنا نہیں چھوڑا۔ اس نے اپنا بیگ کھولا اس میں سے ٹکٹ نکالے اور پھاڑ دیے۔
"مجھے امید ہے کہ اب تم خوش ہو جاؤ گے" اس نے پر سکون لہجہ میں کہا۔ میں نے اسے ہال کھونٹی سے کار کی کنجیاں نکالنے کی آواز سنی۔ اس کے بعد سامنے کا دروازہ بند ہو گیا۔
ایسا لگتا تھا جیسے سُمیت چیخ پڑے گا۔
"بھیا کیا وہ واپس آئے گی" اس نے خوف زدہ آواز میں کہا۔
"کوئی پروا نہیں" میں نے کہا۔ "آؤ ہم تمہارے لیگو سیٹ سے کھیلیں"۔
میں نے اس کے لیے ایک ہوائی جہاز بنایا لیکن میرا دل اس میں نہیں لگا۔ اگر میں

سچ کہوں تو میں شرمندہ تھا"۔ مجھے معلوم تھا میں اپنی حد سے آگے بڑھ گیا تھا۔ سُمیت کا ٹی وی سیریل نشر ہو رہا تھا۔ وہ اسے دیکھنے لگا۔ میں چہل قدمی کے لیے باہر نکل گیا۔ میں تنہائی چاہتا تھا۔

آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ معمولی سی بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ پارک سنسان پڑا تھا۔ میں درختوں کے درمیان راستہ پر تیزی سے چہل قدمی کرنے لگا۔ ہوا چلنے لگی۔ اچانک بارش ہونے لگی۔ میں ایک نیم کے درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ بارش دیر تک ہوتی رہی۔

جب میں پارک سے باہر نکلا تو اندھیرا ہو چلا تھا۔ سڑک پر پھسلن تھی۔ تالاب کی سطح پر گاڑیوں کی ہیڈ لائٹوں کا عکس پڑ رہا تھا۔ آگے چوراہے پر ٹریفک جام تھا۔

ہارن بے صبری سے بج رہے تھے۔ پولیس کی جیپ کی سرخ بتیاں چمک گئیں۔ کوئی حادثہ ہو گیا تھا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے ہجوم کو ہٹاتے ہوئے راستہ بنایا۔ ایک بس نے کار کو ٹکر ماردی تھی۔ وہ ہماری ماروتی ہی کی طرح سفید تھی اور بری طرح کچل گئی تھی۔ اس کے شیشوں کا چورا سڑک پر پھیل گیا تھا۔ ڈرائیور کون تھا؟ کون تھا وہ؟

اسی شام بھی بارش برسی تھی۔ اسی وجہ سے ماں کو دیر ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا تھا کہ وہ کسی بھی لمحہ دفتر سے آسکتی ہے۔

آٹھ............نو............دس

ملازمہ نے ہمیں کھانا کھلایا اور چلی گئی۔

ہم کب سو گئے۔ سُمیت اور میں؟ وہیں کارپیٹ پر ہی ٹی۔ وی۔ کی روشنی میں۔ یہ ٹی۔ وی نہیں تھا جس نے ہمیں جگایا بلکہ دروازہ کی بیل تھی۔ میں سمجھا کہ ماں آگئی۔ لیکن وہ ماں نہیں تھی۔ اب ماں کبھی نہیں آئے گی۔

ایک گیلی سڑک اور ایک ٹرک جس نے توازن کھو دیا تھا۔
نہیں ماں اب کبھی نہیں آئے گی۔

سائرنوں کی آوازیں کم ہو گئی تھیں۔ ٹریفک پھر چلنے لگا تھا۔ میرے اعضا کھل گئے تھے۔ میں مُڑ کر گھر کی طرف بھاگا جیسے کہ بے شمار بھوت میرا پیچھا کر رہے ہوں۔

سُمیت دروازہ کھولتا ہے۔ اس کے گال آنسوؤں میں تر ہیں۔

"ماں.........." وہ ہکلایا "ماں"۔

ہے بھگوان

اور تبھی میں اسے دیکھتا ہوں۔ ٹیلی فون کے پاس۔ وہ ریسیور رکھ دیتی ہے۔

جلدی سے کمر چار کر کے اپنے پاس کھینچ لیتی ہے۔

"میں نے سوچا کوئی چیز...... "وہ میرے کانوں میں سرگوشی کرتی ہے"۔ اب ایسا نہ کرنا ارجن۔

مجھے بتائے بغیر کبھی باہر نہ جانا"۔

میں نے نظریں اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

اس پر فکر طاری تھی، درد تھا اور پھر سکون۔ اور پیار بھی۔

میں نے دیکھا کہ واقعی وہ چہرہ میری ماں کے چہرے سے مختلف نہیں تھا۔
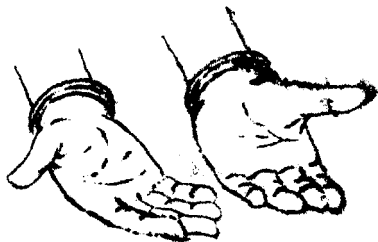
بڑھتے ہوئے درد

میرا بی

۷ر جنوری ۱۹۹۷ء

پیاری ڈائری۔
ہائے۔ میرا نام میری میتھیو ہے۔ ڈیڈی نے مجھے یہ ڈائری کرسمس پر دی تھی اس سے پہلے میرے پاس کبھی کوئی ڈائری نہیں رہی۔ میں نہیں جانتی کہ اس میں کیا لکھنا چاہیے۔ اچھا اب مجھے اپنا ہوم ورک کرنا ہے۔

۱۱ر جنوری ۱۹۹۷ء

پیاری ڈائری۔
ڈیڈی کہتے ہیں کہ مجھے تمہیں مخاطب کرنا چاہیے جیسے کہ تم ہی میری بہترین سہیلی ہو۔ جب بھی میں محسوس کروں اور جس طرح چاہوں۔ میرے راز، میرے مسئلے، میرے اندیشے...... غرض یہ کہ سبھی کچھ۔ میں نے اپنی بہترین دوست پریا کو تمہارے بارے میں بتایا اور اس نے بھی اس سے اتفاق کیا۔ اپنے خیالوں کا حساب رکھنا بڑی اچھی بات ہے تاکہ برسوں بعد جب میں انھیں پڑھوں تو اچھی یادیں تازہ ہو جائیں۔ میں اسے پسند کروں گی۔ میرے ماہ و سال قلمبند ہو جائیں تاکہ میں پیچھے مڑ کر دیکھوں تو یادوں میں کھو جاؤں۔
پیار
میری

۲۰ر جنوری ۱۹۹۷ء

نیا چہرہ نیا دوست۔

ہے ڈائری۔

میری کلاس میں ایک نئی لڑکی داخل ہوئی ہے۔ اس کا نام عالیہ ہے۔ وہ بہت خوب صورت ہے اور شانتی مس نے مجھے اسے اسکول دکھانے اور پڑھائی میں اس کی مدد کرنے کے لیے کہا ہے۔ عالیہ اور میں نے لنچ میں حصہ داری کی۔ عالی واقعی بڑی پُر لطف لڑکی ہے۔ پریا نے جو میرے ساتھ لنچ لیتی ہے ہمارے ساتھ بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ اس لیے میں نے اس سے سوال کیا آخر کیوں۔ اس نے مجھے ایک احمقانہ وجہ یہ بتائی کہ لڑکوں کے پاس نہیں بیٹھنا چاہیے۔ یہ ایک جھوٹ ہے۔ کیوں کہ پریا کی دوستی ارُن کے ساتھ ہے جو ہمارے قریب ہی ایک گینگ کے ساتھ بیٹھتا اٹھتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ پریا علی سے خطرہ محسوس کرتی ہے لیکن اسے ایسا محسوس کرنے کی کوئی وجہ نہیں کیوں کہ پریا کی جگہ کوئی اور نہیں لے سکتا۔

دوستوں کے ساتھ حصہ داری کی جاسکتی ہے لیکن ان پر قبضہ نہیں جمایا جاسکتا۔

پیار

میری

۳ر فروری ۱۹۹۷ء

ملاپ

پیاری ڈائری۔

مڈ ٹرم ٹیسٹ کے نتائج آگئے۔ مجھے ریاضی میں کم نمبر ملے ہیں۔ پچھلے اسکول میں علی اپنی کلاس کے طلبہ میں سر فہرست تھی۔ جہاں تواریخ اس کی کمزوری ہے وہاں میرے لیے طاقت ہے۔

دو ہفتے پہلے پریا نے لنچ ٹائم میں ہمارے ساتھ بیٹھنے سے انکار کر دیا تھا۔ آج میں نے تھک ہار کر آخری مرتبہ پریا سے بات کی اور اس سے کہا "ہم بچیاں نہیں ہیں کہ لڑائی کریں۔ اپنے آپ کو علی کی جگہ رکھ کر بتاؤ کہ اگر تم ایک نئے اجنبی اسکول میں ایک لڑکی ہوتیں تو کیا محسوس کرتیں؟ تم اب بھی میری بہترین سہیلی ہو۔ اگر میں چاہوں تو میرے اور بھی دوست بن سکتے ہیں"۔ یہ کہہ کر میں چلی آئی۔
لمحوں بعد پریا ہم سے آملی۔ اس نے کہا کہ اس کے پاس بہت سی چپاتیاں ہیں۔ بہر صورت ہم نے بہت اچھا وقت ساتھ ساتھ بتایا۔

پیار

میری

۱۴ر فروری ۱۹۹۷ء

ویلن ٹائن ڈے

پیاری ڈی۔
ش ش ش۔ آج میں تم پر اپنا ایک راز ظاہر کر رہی ہوں اگرچہ میں اس میں یقین نہیں رکھتی۔ آج ویلن ٹائن ڈے ہونے کے سبب پریا اور عالی کے لیے دل کی شکل کے ویلن ٹائن کارڈ بنائے اور انھیں بتایا کہ لنچ ٹائم میں دل کس طرح بنائے جاتے ہیں۔ تبھی پریا کو پراسرار ویلن ٹائن کا خیال آیا۔ پریا نے کہا ہم ارُن کے لیے ایک دل بنائیں گے لیکن اسے گمنام رکھنا۔ اس طرح ہم نے اس کام کو پورا کیا۔ اور اس کے اسکول بیگ میں ڈال دیا۔ میں اس سے پہلے کبھی پکڑے جانے کے خیال سے کبھی خوف زدہ نہیں ہوئی تھی۔ علی کا کہنا ہے کہ اسے کبھی پتہ نہیں چلے گا کہ یہ کام ہم نے کیا تھا۔
مجھے امید نہیں۔

بے دل

میری

۱۴ر مارچ ۱۹۹۷ء

میں بیمار ہوں

پیاری ڈائری۔

معاف کرنا۔ میں نے بہت دن سے کچھ نہیں لکھا۔ میں پچھلے پچیس روز سے بیمار تھی اور خسرہ میں مبتلا تھی۔ بڑا خطرناک تجربہ تھا۔ میرے چہرے اور پورے جسم پر بڑے بڑے دانے ہوگئے تھے۔ میں پوری طرح داغوں سے بھر گئی تھی اب میرے پاؤں پر تھوڑے سے داغ رہ گئے ہیں اور ممی کا کہنا ہے کہ وہ بھی جلدی ہی مٹ جائیں گے۔ مجھے بھی یہی امید ہے۔ مجھے پیر کے دن اسکول جانے کا انتظار ہے کیوں کہ پریا اور علی سے ملنا ہے ورنہ ہوم ورک سے کوئی تعلق نہیں۔

پیار
میری

۱۸ر مارچ ۱۹۹۷ء

پیاری ڈائری

ہائے۔ داغ اب بھی میرے پاؤں پر باقی ہیں لیکن وہ خشک ہوگئے ہیں اور بے خطر ہیں۔ آخر کار میں اسکول پہنچ ہی گئی۔

مجھے اپنے پاؤں کا تھوڑا سا خیال رہا۔ وہ بھی اس وقت جب میں اپنا یونیفارم اسکرٹ پہن رہی تھی۔ پریا اور علی نے مجھے یقین دلایا کہ وہ بمشکل ہی نظر آتے ہیں۔ مجھے دعائیں شمار کرنی چاہیں۔ کچھ ایسے بدنصیب بھی ہیں جن کے پاؤں ہی نہیں ہیں اور یہاں میں خود غرضانہ طریقے سے کچھ داغوں کے لیے پریشان ہو رہی ہوں۔

اس طرح میں احسان مند ہوں۔

پیار
میری

یکم اپریل ۱۹۹۷ء

یوم احمقاں

پیاری ڈائری

اپریل فولس ڈے۔ کیا واقعی آج مجھے احمق بنایا گیا۔ آج تواریخ کی کلاس میں مجھے اپنی کتاب میں ایک ویلن ٹائن کارڈ ملا۔ پہلے تو مجھے شبہ ہوا کہ پریا اور علی نے میرے ساتھ مذاق کیا ہے۔ لنچ میں ان دونوں نے اس بارے میں کوئی اشارہ نہیں کیا بلکہ خلاف معمول خاموش رہیں۔ اس طرح مجھے معلوم ہوا کہ اس کے پیچھے ان کا ہاتھ نہیں تھا۔ تاہم میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا کہ وہ ارون کے بارے میں کہیں مجھے پریشان نہ کریں۔ پریا کو تو بہت صدمہ پہنچا۔ ریاضی کی کلاس کے بعد میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے پریا اور علی کو دل کے بارے میں بتا ہی دیا۔ اور مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ہم تینوں کو ویلن ٹائن کارڈ ملے تھے۔ اب ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ ارجن ہی رہا ہو گا۔

جب ارُن سے سوال کیا گیا تو اس نے سادگی سے کہا کہ "بھلا میں تین ویلن ٹائن کیوں بھیجوں گا؟ کیا تم لڑکیوں نے مجھے پہلے کبھی ویلن ٹائن بھیجا تھا؟"

ای ی ی ی! ہم پریشان ہو گئے۔ خوش قسمتی سے اس وقت سائنس کلاس کے لیے شانتی مس آ گئیں اس طرح ایک ٹیچر نے مجھے بچا لیا۔ ارون نے ہم سب کو باقاعدہ اپریل فول بنایا تھا۔ ہاہاہا۔

احمقانہ

میری

۹/ مئی ۱۹۹۷ء

پیاری ڈائری

مجھے سالگرہ مبارک ہو۔ میرے امتحان ختم ہو چکے ہیں اور میں بارہ سال کی ہو چکی

ہوں۔ میں سوچ رہی تھی کہ میں ریا، علی، خلیل، اور جان کے ساتھ اپنے گھر پر غباروں اور آئس کریم وغیرہ کی سالگرہ پارٹی دوں گی۔ لیکن ممی نے مشورہ دیا کہ مجھے کچھ نیا کام کرنا چاہیے جو ذمہ دارانہ ہو اور دوسروں کے لیے فائدہ مند بھی۔ اور یہ ٹھیک بھی تھا۔ اب میں بچی تو رہی نہیں ہوں۔ تو یہ سالگرہ ہم سب نے ممی اور پاپا کے ساتھ مقامی یتیم خانے میں یتیم بچوں کو مٹھائیاں اور پیسٹریاں تقسیم کر کے منائی۔ نئے دوست بنانے اور ان سے ملنے میں بڑا لطف آیا۔ ان میں سے کئی بچے تو اپنی سالگرہ تک نہیں مناتے۔ مجھے برا محسوس ہوا۔ ان کے ساتھ بِتایا ہوا دن بہترین رہا۔ بارہ برس اور گنتی شماری۔

میری

۲۰رجون ۱۹۹۷ء

پیاری ڈائری

اسکول دوبارہ کھل گئے ہیں لیکن میں یہ اسکول اور گھر سے دور لکھ رہی ہوں۔ ہم پچھلی رات ویک اینڈ پر دادی ماں کے فارم پر پہنچے تھے۔ یہ بڑا دیہی علاقہ ہے۔ مجھے یہ فارم اس لیے پسند ہے کہ یہاں بہت سے جانور ہیں۔ مجھے شہر میں گائیں، بکریاں، طوطے، مچھلیاں اور گھوڑے نظر نہیں آتے۔ مجھے دادی ماں سے کہانیاں سننا اور اپنے رشتہ کے بہن بھائیوں کے ساتھ کھیلنا بہت پسند ہے۔ ان کے نام ڈیوڈ، آشا، ودیا، پال اور ریا ہیں۔ ریا اور میں ہم عمر ہیں اور ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ ہم نے کھیتوں میں کھیل کھیلے ندی میں تیراکی کی اور جانوروں کو چارہ کھلا کر دن بتایا۔ اس کے ساتھ ہی اپنا پسندیدہ شوق درختوں پر چڑھ کر پورا کیا۔ یہاں زندگی بہت سادہ ہے۔ نہ تو ٹی وی ہے اور نہ ہی کار۔ البتہ ریڈیو اور بیل گاڑی ہے۔ بعض اوقات شہر کے شور کی آلودگی سے دور ہو جانا بہت اچھا لگتا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ تمہیں ہمیشہ مختلف لوگوں اور مقامات کا تجربہ ہونا چاہیے نہ کہ انہیں پرکھنے کا۔ اس تجربہ کو قبول کرو اور اس کا لطف اٹھاؤ۔

پیار

میری

۷؍جولائی ۱۹۹۷ء

وفات

پیاری ڈائری
آج بدترین دن ہے۔ میں نے علی کی ممی کے جنازے میں شرکت کی۔ وہ کینسر کے مرض میں مبتلا رہ کر کل رات فوت ہو گئیں۔ وہ کثرت سے سگریٹ پیتی تھیں۔ ہم اس دوست سے کیا کہہ سکتے ہیں جس نے اپنے ایسے شخص کو کھو دیا ہو جس سے وہ عشق کرتا ہو؟ میں کچھ نہیں جانتی تھی اس لیے میں نے علی کا ہاتھ تھاما اور اس کے ساتھ ساتھ ہی رہی۔ سگریٹ نوشی، شراب نوشی، دوائیں، آخر لوگ یہ سب کیوں کرتے ہیں۔ اگر تمام سگریٹ نوش، شراب نوش اور دوائیں لینے والے اس دردناک جنازے میں شریک ہوئے ہوتے تو ان پر اس حقیقت کا اعتراف ہوتا کہ وقتی طمانیت فضول سی چیز ہوتی ہے کیوں کہ آخر کار جو چیز انہیں ملتی ہے وہ ہے...... موت۔

میری

۲۲؍اگست ۱۹۹۷ء

پیاری ڈائری
کل علی کی بارہویں سالگرہ تھی۔ قدرتی بات ہے کہ ہم نے اسے نہیں منایا۔ وہ تو ہمیں اپنے گھر آنے ہی نہیں دینا چاہتی تھی۔ لیکن میں اور پریا اس کے گھر پہنچ ہی گئے۔ پھر دوست ہوتے ہی کس لیے ہیں؟ سالگرہ پر کسی کو تنہا نہیں ہونا چاہیے خاص طور سے ایسے حالات میں۔
علی کا وزن بہت گھٹ گیا ہے اور اس میں زندگی باقی نہیں رہ گئی ہے۔ نہ ہی وہ علی ہے جس سے ہم واقف تھے۔ ہم اس کی ممی کی قبر پر گئے۔ دعائیں کیں اور ایک دوسرے کو پکڑ کر چیخے چلائے۔
میں ایک ایسی بچی تھی جو زندگی کو پریوں کی کہانی سمجھتی تھی۔ لیکن وہ سخت اور بڑی جابر ہے۔

میری

۲۹ر ستمبر ۱۹۹۷ء

نیا جذبہ پیاری ڈائری

زندگی بڑی اچھی چیز ہے۔ علی دوبارہ اپنے حال پر واپس آگئی ہے۔ اسکول میں مقابلہ جاتی ہفتہ چل رہا ہے۔ علی، پریا اور میں نے تمام مقابلوں میں مثلاً رقص، ڈراما، تقریر، موسیقی وغیرہ میں حصہ لیا ہے۔ میرے خیال میں دوبارہ ایک بچہ کی طرح خوش رہنا بڑی عظیم چیز ہے۔ بڑی مدت کے بعد۔

ہم اپنے اچھے وقتوں کو برے وقتوں میں ڈبو نہیں سکتے۔ میں زندگی سے پیار کرتی ہوں۔

پیاری

میری

اکتوبر۔ نومبر ۱۹۹۷ء

تیاریاں

پیاری ڈائری

ایک بار پھر امتحانوں کا بخار چڑھ گیا ہے۔ انسان کی بنیاد کے لیے تعلیم لازمی چیز ہے۔ میرے نزدیک بالغ ہونے اور بڑھنے میں تعلیم کا ایک اہم حصہ ہوتا ہے۔ بھاری چیز۔

افسوس ناک بات یہ ہے کہ امتحان بھی مقابلہ جاتی بن سکتے ہیں۔ میں پڑھائی میں اپنے آپ کو تھکاتی نہیں اور نہ ہی امتحان کے بخار کی کش مکش میں خوف زدہ ہو کر اپنے آپ کو گراتی ہی ہوں۔ میں ایک دن پڑھائی کے ایک حصے اور شیڈول کو طے کرتی ہوں۔

مجھے اپنے آپ کو گنوانا نہیں ہے۔

پیار

میری

۳۱ر دسمبر ۱۹۹۷ء

پرچھائیاں

پیاری ڈائری

ہم اس سال کے خاتمہ پر پہنچ گئے ہیں۔ بارہ مہینے بیت چکے ہیں اور ہر ماہ میں اندر اور باہر سے بڑھ رہی ہوں۔ زندگی کے اپنے اچھے اور برے لمحے ہوتے ہیں۔ اب یہ مجھ پر منحصر ہے کہ میں دونوں میں سے چھان بین کر کے یہ سمجھوں کہ میں نے کیا سیکھا ہے اور کیا تجربہ حاصل کیا ہے اور اسے یاد رکھوں۔

بڑھتے ہوئے درد کبھی ختم نہیں ہوتے اور انہیں سہل ہونا بھی نہیں چاہیے لیکن مجھے معلوم ہے کہ میں اپنے عقیدے، کنبہ اور دوستوں کی مدد سے ان پر غالب آجاؤں گی۔

ہمیشہ پیار

میری